نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ ہے۔

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۳	فہرست مضامین ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء	جلد ۲۶

ملاحظات ۔۔۔۔۔۔ ۲

خواتین عرب کی فیشن طرازیاں ۔۔۔۔۔۔ ۹

دو رُخ ۔۔۔ تمنائی ۔۔۔ ۱۵

نغمۂ دل ۔۔۔ مرزا احسان احمد بی اے ۔۔۔ ۱۸

حیات و ما ورائے حیات ۔۔۔۔۔۔ ۳۴

مکتوبات نیاز ۔۔۔۔۔۔ ۴۰

دختر کفش دوز ۔۔۔ طاہرہ دیوی شیرازی ۔۔۔ ۴۸

ریاض مرحوم ۔۔۔۔۔۔ ۵۴

باب المراسلۃ والمناظرۃ ۔۔۔۔۔۔ ۵۶

باب الاستفسار ۔۔۔۔۔۔ ۵۸

مطبوعات موصولہ ۔۔۔۔۔۔ ۶۷

کیوپڈ و شاعر ۔۔۔ محمد صادق ضیا چینوٹوی ۔۔۔ ۷۱

منظومات ۔۔۔ عدم - روش - اختر ۔۔۔ ۷۴

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۶	ستمبر ۱۹۳۴ء	شمارہ ۳

ملاحظات

ہندوستان کی عورت کا مستقبل ــــ

وہ لوگ جو جدید تعلیم اور ترقی کو مترادف سمجھتے ہیں، اُن کے لئے یہ امر یقیناً باعث مسرت ہے کہ ہندوستان کی عورت میں علم کا ذوق بڑھتا جاتا ہے اور کالجوں کی کرسیوں پر وہ بھی مردوں کے دوش بدوش بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے. لیکن کیا عورتوں کا یہ رجحان واقعی قابل مسرت امر ہے، کیا عورت کا تعلیم جدید حاصل کر لینا حقیقتاً ملک و قوم کے مستقبل کے لئے کوئی امید افزا بات ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں

اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسانی ترقی کا واحد ذریعہ صرف علم ہے، لیکن ترقی اور علم کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف رائے ممکن ہے، پھر یہی وہ چیز تھی جس نے عرصہ تک مشرق کو مغرب سے علحدہ رکھا اور اب یہی

وہ چیز ہے جو مشرق کو مغرب کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ اس لئے آئیے سب سے پہلے ترقی کا مفہوم متعین کریں، یعنی سب سے پہلے "غایت و نتیجہ" کو سمجھ لیں اور پھر غور کریں کہ اس مقصود تک پہونچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں وہ درست ہیں یا نہیں

ترقی سے مراد یقیناً دنیاوی ترقی ہے اور اس باب میں مذہبی نظریوں کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم یہ سوال بدستور اپنی جگہ قایم رہتا ہے کہ کیا مادہ سے ہٹکر کوئی مفہوم دنیاوی ترقی کا متعین نہیں ہو سکتا اور کیا اخلاقِ انسانی کے نتایج صرف حیات بعد الموت ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس دُنیا سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ممکن ہے ایک تاریک خیال مولوی یا پنڈت اس کے جواب میں یہی کہے کہ اس دُنیا کی ترقی کوئی چیز نہیں، اس عارضی زندگی کی مسرت و اذیت لایعنی بات ہے، لیکن میں کہ میرے نزدیک انسان کو پھر دوبارہ زندہ ہونا نہیں ہے، یہی کہوں گا کہ انسان کے تمام افعال و اخلاق اسی دنیا سے متعلق ہیں اور اُن کو کسی اور عالم سے متعلق کرنا خدا یا فطرت کی توہین ہے —— اچھا اب اس اصول کو سامنے رکھکر کہ جو کچھ ہے اسی دُنیا میں ہے اور اس کے بعد انسان کو نسیًا منسیًا ہو جانا ہے، غور کیجئے کہ ترقی کا مفہوم کیا ہونا چاہئے

"آدمی" نام نہ صرف میرا ہے، نہ آپ کا، نہ مغرب کے باشندہ کا، نہ مشرق کے رہنے والے کا، نہ گاما پہلوان کا، نہ مجھ ایسے نحیف و ناتواں انسان کا، نہ "ترکانِ سمرقندی و سیہ چشمانِ کشمیری" کا اور نہ حبش کی سیاہ فام بدصورت مخلوق کا۔ بلکہ لفظ "انسان" ایک ایسے "مفہوم کُلی" کو پیش کرتا ہے جس میں شکل و صورت کا اختلاف، نسل و رنگ کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا، اور اگر ہم اُس کے کسی ایک فرد کو بھی نظر انداز کر دیں تو اس کے حقیقی مفہوم کا مجروح ہو جانا یقینی ہے —— پھر "انسان و انسانیت" کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ نوعِ انسانی کی موجودہ ترقیاں یا اس کے علمی اقدامات کس حد تک قابل اعتنا ہیں

کہا جاتا ہے کہ یہ مغرب و اہلِ مغرب کی ترقی کا دور ہے اور اُن کے علمی اکتشافات نے انسان کے ذہنی ارتقاء کے لئے ایسی ایسی نئی راہیں پیدا کر دی ہیں کہ اس سے قبل کسی زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھیں، اور ایسا کیوں کہا جاتا ہے؟ غالباً اس لئے کہ اس نے طبیعیات کے بہت سے نوامیس کو بے نقاب کر دیا ہے، وہ عناصر پر مالکانہ تصرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور شاید اس لئے بھی کہ اس نے سوسائٹی کی بہت سی قیود دُور کر کے اخلاق کے ایسے جدید نظریئے قائم کئے ہیں جو عقل سے زیادہ جذبات کا ساتھ دینے والے ہیں

یقیناً اس توجیہ میں کوئی غلطی نہیں ہے اور کون ہے جو مغرب کی ترقی علوم و فنون سے انکار کر سکے۔ لیکن یہ سوال بدستور اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ کیا یہ ترقی واقعی "نوع انسانی" کی اجتماعی ترقی ہے یا انفرادی خود غرضی کی تکمیل یعنی اس عروج عقل و فراست میں کوئی شائبہ انسانی خلوص و ہمدردی کا پایا جاتا ہے یا نہیں اور کیا یہی وہ معیار ہے جس سے ہم ترقی کے کھرے کھوٹے کو پہچان سکتے ہیں۔ — بیشک آج انسان، کشش زمین کا مقابلہ کر کے اس کوشش میں کامیاب ہو گیا ہے کہ وہ فضائے بسیط میں جہاں چاہے اُڑتا پھرے، لیکن کیا یہ کیفیت پرواز اس کو "عقاب" سے زیادہ کسی اور خطاب کی مستحق قرار دے سکتی ہے۔ — یہ صحیح ہے کہ وہ پانی کے مقابلہ میں اپنے ثقلِ نوعی کو گھٹا کر سمندر کی تہ تک پہونچ جانے میں بھی لیس و پیش نہیں کرتا۔ لیکن کیا اس باب میں وہ مچھلیوں سے زیادہ ترقی کر سکا ہے۔ یہ بھی غلط نہیں کہ وہ آناً فاناً اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دور دراز ملکوں کے حالات معلوم کر لیتا ہے، مگر یہ شعور اُن تمام وحوش و طیور میں بھی پایا جاتا ہے جو روے زمین کے مختلف حصوں کی آب و ہوا کا حال معلوم کر کے تبدیل موسم کے لئے نقل مکانی کیا کرتے ہیں۔ —— یہ بھی درست ہے کہ علوم و فنون کی ترقی سے کام لیکر اس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت نے بے شمار دولت جمع کر لی ہے۔ لیکن کیا یہ نوع انسانی کے کام نہ آنے والی دولت اُن کوہساروں اور معدنوں کی دولت سے زیادہ اہم ہے جو زر و جواہر سے معمور نظر آتے ہیں؟ اور پھر اگر یہ تمام ترقیاں صرف "غیر نفع بخش" حد تک قائم رہتیں تو بھی کوئی حرج نہ تھا لیکن قہر تو یہ ہے کہ وہ بجائے نفع کے نقصان پہونچانے والی ہیں اور آج دنیا کے امن و سکون کا سب سے بڑا خطرہ انھیں ترقیوں سے متعلق ہے۔ — عقاب آسمان میں اُڑتا ہے، لیکن وہ بم کے گولے برسا کر معصوم آبادی کو ہلاک تو نہیں کر سکتا، مچھلیاں سمندر کی تہ میں تیرتی پھرتی ہیں، لیکن وہ آبدوز سرنگیں بچھا کر خدا کی مخلوق کو تباہ تو نہیں کرتیں، معدنیں اپنی آغوش میں دولت کا انبار لئے ہوئے ہیں، لیکن وہ مزدوروں کے حقوق تو پامال نہیں کرتیں اس لئے محض علمی اختراعات، یا تجارتی ترقی و خوشحالی کو انسانی ترقی سمجھنا انفرادی طور پر خواہ کتنا ہی صحیح ہو، لیکن اجتماعی حیثیت اور انسان کے مفہوم کلی کے اعتبار سے یقیناً اس کو انحطاط و زوال سے تعبیر کیا جائے گا۔

اچھا اب اس تمہید کے بعد اصل مدعا کی طرف آئیے اور غور کیجئے کہ ہندوستان کا رجحان کیا ہے اور اس پر کیا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ — کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بھی بیدار ہو چلا ہے اور اگر اس مختصر فقرہ کی توضیح کی جائے تو بالفاظ دیگر مفہوم یہ قرار پائے گا کہ ہندوستان بھی مغرب کے نقش قدم پر چل رہا ہے اور ترقی کی جو راہیں اس نے متعین کی ہیں، ہمارا ملک بھی آمنّا و صدقنا کہکر انھیں پر چل کھڑا ہوا ہے۔ — یہاں تک کہ وضع و معاشرت، گردار و گفتار، اور زبان و ذہنیت وغیرہ سب کچھ مغرب ہی کے ذوق میں ڈھل رہی ہے اور جس طرح یہاں کے ایک مرد کا انتہائی نقطۂ نظر "انگریز" بنجانا ہے، اسی طرح

یہاں کی عورت کا نصب العین "میم" ہو کر رہ جاتا ہے - پھر قبل اس کے کہ یہاں کی عورت میم بنے، اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ میم کیا چیز ہے اور حوا کی ان مغرب نژاد بیٹیوں میں جو آزادی نظر آتی ہے اس کی ترکیب میں کیا کیا اجزا شامل ہیں - یقیناً فطرت کے لحاظ سے عورت آزاد ہے اور قدرت کے تمام عطایا سے وہ بھی فائدہ اٹھانے کی مستحق ہے، لیکن کیا اس فرق و امتیاز کو مٹایا جا سکتا ہے جو عورت و مرد کی تخلیق میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور اگر عورت بھی مردوں ہی کی سطح پر آکر تمام کام کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے تو کیا قدرت پر یہ الزام عاید نہیں ہوتا کہ اس نے کیوں دونوں کی تخلیق ایک دوسرے سے مختلف رکھی اور کیوں ایک کو قوی اور دوسرے کو کمزور پیدا کیا؟ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ اعتراض ہو کہ یورپ کی موجودہ عورت نے اس اختلاف کو مٹا کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی طرح قوی و مضبوط ہو سکتی ہے - لیکن یہاں سوال اکتساب و سعی کا نہیں بلکہ صرف فطرت و مقتضائے فطرت کا ہے، ورنہ یوں تو ہر وہ بندر اور ریچھ جو دو پاؤں پر چلنا سیکھ لے دعوے کر سکتا ہے کہ میں انسان ہوں --- اس میں شک نہیں کہ ایک انسان سعی و کوشش سے بہت کچھ ترقی کر سکتا ہے، لیکن فطری اقتضا، اس کا کبھی محو نہیں ہو سکتا - آپ ایک شخص کو جو قدرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر نہیں آیا ہزار کوشش کے بعد بھی شاعر نہیں بنا سکتے، لاکھ تدبیریں کیجئے مگر ایک شخص ماہر ریاضیات نہیں ہو سکتا اگر فطرت نے اس کے دماغ میں اس کی اہلیت پیدا نہیں کی، الغرض ایڈیسن پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں اور شیکسپیر ماں کے پیٹ ہی سے شیکسپیر بن کر آتا ہے - پھر عورت لاکھ کوشش مرد بننے کے لئے کرے لیکن آخر کار وہ رہیگی فطرت کے اعتبار سے عورت ہی، خواہ وہ اس سعی و اقدام میں کتنے ہی ہنگامے کیوں نہ برپا کرے --- پھر دیکھئے کہ عورت کی فطرت کیا ہے، یعنی قدرت کا مقصود اس کی آفرینش سے کیا ہے؟ اس کے دماغ و اعضا کی ساخت سے بحث نہیں بلکہ صرف نظام تمدن کے اس تدریجی ارتقاء کو دیکھئے جس نے دنیا کو آہستہ آہستہ علم و روشنی کی اس منزل تک پہونچا دیا ہے اور سوچئے کہ تاریخ تمدن میں عورت کی خدمات کس طرح شروع ہوئیں اور اس نے تعمیر عمرانیت میں کیا حصہ لیا؟ --- عہد وحشت میں بھی جب اصولاً عورت کو زیادہ قوی، زیادہ محنتی و جفاکش اور زیادہ جنگجو ہونا چاہئے تھا، وہ مردوں سے دوش بدوش صحرائی درندوں کا مقابلہ نہیں کرتی تھی، بلکہ ان زخموں کے اندمال میں مصروف رہتی تھی جو "تنازع للبقا" کے سخت و سنگین اصول کے ماتحت مردوں کو پہونچتے تھے، درانحالیکہ یہ بات اس کو کسی نے نہ سکھائی تھی - اگر مرد دن بھر خاک بسر مارا مارا پھرتا تھا تو عورت کسی درخت کے نیچے خس و خاشاک مہیا کر کے اس کے لئے بستر طیار کرنے میں مصروف رہتی تھی اور اگر مرد شکار کی جستجو میں بھوکا پیاسا سرگرداں رہتا تھا تو یہ اس فکر میں مبتلا رہتی تھی کہ شام کو جب وہ واپس آئے تو فوراً اپنی بھوک اور خستگی کو دور کر سکے، وہ بچوں کو پالتی تھی کھانا پکاتی تھی، پانی چشموں سے لاتی تھی، ملبوس طیار کرتی تھی، سر چھپانے کے لئے مکان بناتی تھی اور اسی کے ساتھ مرد کے تھکے ہوئے خستہ اعصاب کو اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے مس کر کے راحت و سکون پہونچایا کرتی تھی --- پھر زمانہ گزرتا گیا اور انسان کی تمدنی ترقی وسیع ہوتی گئی، لیکن عورت کی اس خدمت کی نوعیت بدستور قائم رہی اور اس کے ان فطری مشاغل میں سوائے اس کے

کوئی فرق نہ پیدا ہوا کہ اگر پہلے وہ یہ تمام کام اپنے ہاتھوں سے بھدّے طریقہ پر دیر میں انجام دیتی تھی، تو بعد کو آلات کے ذریعہ سے خوشنمائی کے ساتھ جلد انجام دینے لگی ۔۔ اگر پہلے وہ اپنے بچہ کو صرف اپنی آغوش میں پالتی تھی تو بعد کو طرح طرح کے پالنے بنائے اور دوسری عورتوں کی خدمات حاصل کرکے اُن کی گود سے فائدہ اُٹھایا ۔ الغرض تمدنی ترقی کے ساتھ عورت کی خدمات میں بھی زیادہ شائستگی پیدا ہوتی گئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس کے خدمات کی نوعیت بدل گئی ہو، یا یہ کہ اس نے مردوں کے فرائض اپنے سر لینا پسند کیا ہو ۔۔ اسی طرح زمانہ گزرتا گیا اور انسان کی اہلی زندگی کا نظام بدستور اسی حال پر قایم رہا کہ دفعۃً جنگِ عظیم کا شعلہ بھڑک اُٹھا اور مردوں کے میدانِ حرب میں چلے جانے اور اُن کی کثیر تعداد قتل ہو جانے سے عورت مجبور ہوئی کہ وہ بعض ان خدمات کو بھی انجام دے جو مرد کے سپرد تھیں اور اس طرح گویا یہ پہلا قدم تھا عورت کی اس آزادی کا جس نے اس کے اندر مرد کی طرف سے بعد کو بغاوت کے جذبات پیدا کر دئے ۔ یہ بحث طویل ہے کہ عورت میں مرد کے طرف سے بے نیازانہ جذبۂ آزادی کیوں پیدا ہوا، لیکن مجملاً یوں سمجھئے کہ اس کا بڑا سبب صرف یہ تھا کہ مرد و عورت کی تعلیم وہاں بالکل یکساں اصول پر جاری تھی اور اُصولِ تربیت میں کوئی ایسا فرق و امتیاز نہ باقی رہ گیا تھا جو مرد و عورت کے جذبات و خیالات میں حدِّ فاصل قائم کر سکے ۔ عورت کو سالہا سال سے یہ تعلیم دی جا رہی تھی کہ وہ مرد کے مساوی ہے لیکن اس مساوات کا یہ مفہوم نہ بتایا جاتا تھا کہ اپنی اپنی خدمات کے لحاظ سے نظامِ تمدن میں دونوں یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت، مردانہ فرائض میں بھی اپنے آپ کو اس کا مساوی سمجھنے لگی اور جب جنگِ عظیم میں اس کا ایک حد تک کامیاب تجربہ بھی ہو چکا تو پھر عورت جو مرد کی ناجایز آزادیِ اخلاق سے پہلے ہی کافی بیزار تھی، دفعۃً تمام قیود کو توڑ کر اس میدان میں بھی آ گئی جو مردوں کے لئے مخصوص تھا، یہاں تک کہ آج وہ مرد سے کلّہ بہ کلّہ لڑنے کے لئے طیار ہے اور اہلی زندگی کا وہ توازن جو صرف امتیازِ خدمات اور تقسیمِ عمل کے احساس پر قایم رہ سکتا ہے یکسر درہم برہم نظر آتا ہے ۔۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر مغرب کی موجودہ نسائی ذہنیت میں اہلِ ہند کو کوئی بُرائی نظر نہیں آتی اور ہر شخص اُن کے صحیح و توانا جسم، اُن کے شگفتہ چہروں اور مضبوط اعصاب کو دیکھ کر یہی حکم لگائے گا کہ مغربی سوسائٹی سعادت و برکت کی انتہائی حد تک پہونچ گئی ہے لیکن وہ لوگ جنھوں نے ان کی اندرونی زندگی و معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اُن سے پوچھئے کہ اس کی گندگی و پریشانی کا کیا عالم ہے اور وہ حسین جمیل چہرے جو غازہ کے نیچے دوسروں کو پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، مردوں کی اہلی زندگی کی راہ میں کتنے کانٹے بچھا رہے ہیں ۔۔ پھر کیا ہندوستان کے اربابِ تعلیم کے لئے یہ مسئلہ قابلِ غور نہیں ہے کہ جس نصاب اور اصولِ تعلیم نے مغرب کی عورت کو اس حد تک جری و بیباک بنا دیا ہے کیا وہ مشرق کی عورت میں کوئی اور ذہنیت پیدا کر سکتا ہے اور کیا یہاں کا مرد اس عذاب سے بچ رہیگا جو اسی تعلیم کے بدولت مغرب کے مرد پر مسلّط ہوا ہے؟ ۔۔ گزشتہ ربع صدی کے اندر ہندوستان کی عورت نے تعلیم میں کافی ترقی کی ہے اور یہ احساس کہ عورت کے لئے تعلیم ضروری ہے آج ہر گھر میں

پایا جاتا ہے، لیکن عورت کی اس خواہش کو بالکل اسی غلط اُصول پر پورا کیا جا رہا ہے جو مغرب میں رائج ہوا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی عورت بھی سوائے عورت رہنے کے اور سب کچھ ہو جانے پر مائل نظر آتی ہے ---- پھر اس خرابی کا باعث یقیناً عورت کا رُجحان تعلیم نہیں، بلکہ وہ اسلوب تعلیم اسکا باعث ہے، جس نے مغرب کی تہذیب، مغرب کی معاشرت اور مغرب کی ذہنیت کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے ---- لڑکیوں کے مدارس میں نظم و نسق اور تعلیم کی ذمہ داری زیادہ تر عیسائی خواتین کے ہاتھ میں ہے یا اُن خواتین کے جو باوجود غیر عیسائی و غیر مغربی ہونے کے اپنے آپ کو اسی رنگ میں پیش کرنا پسند کرتی ہیں اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندوستان کی عورت میں بیبیں کی ذہنیت باقی رکھیں گی، بالکل دور از کار بات ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جو انقلاب ایک لڑکی کی ذہنیت میں اسکول کی تعلیم سے پیدا ہوتا ہے، وہ آرایش و زیبایش سے وابستہ ہوتا ہے اور میرے نزدیک یہ سب سے پہلا جرثومہ ہے جو آہستہ آہستہ پہلے بیجا نمود و نمایش اور پھر بیجا آزادی و بیباکی پیدا کرنیکا باعث ہوتا ہے ---- یقیناً زیبایش و آرایش، تجمیل و تحسین عورت کی صفت ہے، لیکن اس کی زندگی کا حقیقی مقصود تو شاید یہ نہیں اور اس لئے اگر ثانوی حیثیت سے اس طرف توجہ کی جائے تو خیر، لیکن اس کو اصل کار کی حیثیت دیدینا یقیناً کبھی مفید نہیں ہو سکتا ---- دیکھا جاتا ہے کہ اُستانیاں اکثر و بیشتر جوان اور ناکتخدا ہوتی ہیں، اور یہ دوسرا اہم سبب خرابی اخلاق کا ہے، کیونکہ خود ان کا اکثر وقت اس نمود و نمایش میں بسر ہوتا ہے جو مردوں کے سوسائٹی میں کشش قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے اور ان کا دماغ کسی وقت اس خیال سے خالی نہیں رہتا کہ وہ جوان ہیں، دلکش اداؤں کی مالک ہیں اور انھیں جذبات کو ساتھ لیکر وہ کلاس رُوم میں لڑکیوں کے سامنے آتی ہیں۔ وہ ملازمت اس لئے نہیں کرتیں کہ لڑکیوں کو پڑھائیں یا اُن کے اخلاق کو سدھاریں بلکہ ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ روپیہ حاصل کرکے عطر و غازہ کے فضول مصارف کو پورا کر سکیں اور تختۂ رقص پر وہ بہترین وضع و ملبوس کے ساتھ جلوہ آرا ہوں ---- پھر اسی کے ساتھ تعلیم نصاب کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی کوئی بات ایسی نہیں جو عورت کو اس کے حقیقی نسائی خدمات کی طرف متوجہ کرنے والی ہو، وہی نصاب جو لڑکوں کے لئے مقرر ہے، لڑکیوں کو بھی پڑھایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ کبھی کبھی (اور وہ بھی بطور تفنن) سینے پرونے یا کھانا پکانے کا بھی درس دیدیا جاتا ہے، کوئی اور فرق لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب یا طریق تعلیم میں نہیں ہے ---- تعلیم کا اصل مقصود یہ ہے کہ ہر فرد میں اس کے فرائض کا احساس پیدا ہو جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور اگر یہ صحیح ہے کہ دونوں کے فرائض علحدہ علحدہ ہیں تو اصولاً ان کی تعلیم کا معیار بھی علحدہ علحدہ قائم ہونا چاہئے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت میں رفتہ رفتہ خودسری و آزادی پیدا ہو جائیگی جو اُسے مرد تو نہیں بنا سکتی، لیکن مرد کیلئے اسے یسیر الحصول ضرور کر دینے والی ہے، یہی وہ عذاب ہے جس میں آج یورپ کا مرد مبتلا ہے اور ہندوستان کے مرد کے سامنے بھی ہے اگر اس نے اس کا سدباب نہ کیا ---- اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی عورت کی یہ بدنصیبی کہ اگر آج اس کا شوہر مر جائے تو کل سے اسے فاقہ کرنا ناگزیر ہے

اس بات کو لازم قرار دیتا ہے کہ وہ معاش کی طرف سے خودمختارانہ زندگی بسر کرنے کی اہل بنائی جائے، لیکن اس کا علاج اسکول کی تعلیم نہیں کیونکہ اس حیثیت سے یہ تعلیم خود مردوں کے لئے بھی مفید و کارآمد ثابت نہیں ہوئی، چہ جائیکہ عورتیں جو نسبتاً کم تعلیم یافتہ ہوتی ہیں اور شدائد کا مقابلہ کرنیکی زیادہ ضعیف اہلیت رکھتی ہیں ۔۔ اس لحاظ سے عورت کی تعلیم تو ضروری ہے، لیکن وہی تعلیم جو اُسے کسب معاش میں مدد دیسکے نہ یہ کہ اُسے بہترین آلۂ تفریح بنادے ۔۔ اس راز کو اگر ایشیا کے کسی ملک نے سمجھا ہے تو وہ صرف جاپان ہے کہ وہاں آپ کو ایک عورت بھی غیر تعلیم یافتہ نہ ملیگی، لیکن یہ تعلیم وہ نہ ہوگی جو اُسے مرغ زریں تو بنادیتی ہے لیکن سوائے اِترا کر چلنے کے اور کسی کام کا نہیں رکھتی ۔۔ اُس کو سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ نسائی زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ خارزارِ حیات میں مردوں کے ساتھ چلکر اس کے پاؤں کے کانٹے بھی نکالنا پڑتے ہیں یعنی اگر جوے کا ایک سرا مرد کے شانہ پر رکھا ہوا ہے تو دوسرا اس کے شانہ پر بھی ہے وہ گھر کی ملکہ ہے اور ایک ملکہ ہی کی طرح اس کا انتظام کرتی ہے، شوہر کو وہ اپنا سچا رفیق جانتی ہے اور کشاکشِ حیات میں وہ پوری طرح اس کا ہاتھ بٹاتی ہے وہ اپنے بچوں کو خود دودھ پلاتی ہے، خود ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہے اور بیکار وقت ضایع کرنا اس کے مذہب میں جرم عظیم ہے۔ وہ خود بھی ہر وقت کام میں مصروف رہتی ہے، اپنے بچوں کو بھی مصروف رکھتی ہے، یہاں تک کہ جب شام کو مرد گھر واپس آتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اگر دن بھر محنت کرکے اس نے اپنے متعلقین کے خورونوش کا سامان فراہم کیا ہے تو انھوں نے بھی اسکی راحت و آسایش کے اسباب فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اسی تربیت نے وہاں خانگی صنعت (Home Industry) کو اتنا عام و وسیع کردیا ہے کہ گھر کا کوئی فرد کسی وقت بیکار نہیں رہتا اور ہر عورت میں اتنی اہلیت پیدا ہوگئی ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنے اور بچوں کے لئے کسب معاش کرسکے ۔۔ برخلاف اس کے ہمارے یہاں کی عورت کو دیکھئے کہ تعلیم نے ان کے اندر کیا انقلاب پیدا کیا ہے۔ بچوں کو دودھ پلانا اُن کے نزدیک معیوب، گھر کا کام کرنا خلافِ شان، اور مرد کے جذبات کی رعایت نسائیت کی توہین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ آرایش وضع و ملبوس میں کافی مہارت رکھتی ہیں، لیکن اس تحسین و تجمیل کا ہدف گھر سے باہر ڈھونڈھا جاتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کی رفتار و گفتار میں کافی دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ان کے لبوں کی مسیحائی اور ان کے خرام ناز کی جاں بخشیاں ان کے شوہروں کا مقسوم نہیں۔ وہ اپنے آپ کو مردوں سے علحدہ ایک مستقل چیز ثابت کرنے کی تو کوشش کرتی ہیں لیکن حال یہ ہے کہ اگر آج اُن کے شوہر مرجائیں یا چھوڑ دیں تو سوائے عشوہ فروشی کے کوئی اور ذریعہ اُن کے پاس کسب معاش کا نہیں رہتا ۔ پھر بتائیے کہ یہ تعلیم ملک و قوم کے لئے کیا خاک مفید ہوسکتی ہے اور ہم ایسی تعلیم یافتہ عورتوں کو کیا کریں جو "مالِ عرب" کے بجائے "مالِ یغما" بنجانا پسند کرتی ہیں ۔۔ افسوس ہے کہ ملک کے ارباب فہم نے تعلیم نسواں کی طرف تو پوری توجہ کی، لیکن اسوقت تک یہ نہ معلوم کرسکے کہ جس راہ کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ "کعبہ" کی طرف جاتی ہے یا "ترکستان" کی طرف!

نیاز

خواتین عرب کی فیشن طرازیاں

(عہد جاہلیۃ و اسلام میں)

عورت، ہر جگہ عورت ہے، خواہ وہ کشمیر کے مرغزاروں میں پیدا ہوئی ہو، یا صحرائے عرب کے ریگزاروں میں۔ عورت کی یہ حس کہ وہ حسین ہے، جاذب قلب و نظر ہے اور یہ کہ "زیب دیتا ہے اُسے دشمنِ ایماں ہونا" یوروپ و ایشیا ہر جگہ یکساں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگر ایک اپنا دامن مرد کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتی تو دوسری بگڑ کر یہ کہہ گزرتی ہے کہ

میرا دامن چھوڑئیے اپنا گریباں پھاڑئیے

الغرض عورت حسین ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ کو ایسا ضرور سمجھتی ہے اور یہی وہ حس ہے جو اس میں جذبۂ آرائش و زیبائش پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ حس جو آج مغرب کی عورت میں اسقدر نمایاں طور پر پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل ایشیا کی عورت میں بھی پائی جاتی تھی اور جن اسباب غمزہ و ناز سے آج مغرب کی عورتیں آراستہ نظر آتی ہیں، انھیں اسباب سے خواتین ایشیا بھی کسی وقت آراستہ تھیں۔

خواتین یوروپ کی ابداع و اختراع وضع و ملبوس آج ضرب المثل ہے لیکن تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایشیا کی عورت بھی یہی ذہنیت رکھتی تھی اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے ہر جگہ اور ہمیشہ اس نے اس ابداع و اختراع سے کام لیا۔ بعض کا خیال ہے کہ خواتینِ عرب عہد جاہلیت میں اپنے وضع و ملبوس کے لحاظ سے سخت وحشی تھیں اور ان میں زیبائش و آرایش کا خیال بڑی حد تک معدوم تھا حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ وہ آرائش و زیبائش کے مختلف طریقوں سے واقف تھیں، ملبوس کی تراش و خراش میں بھی اختراع سے کام لیتی تھیں اور وضع میں رنگینیاں پیدا کرنا بھی انھیں معلوم تھا۔ پھر چونکہ اُن کا نہ کوئی دین تھا، نہ قانون اس لئے اس ذوقِ آرائش میں اعتدال قائم رکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی اور اسی لئے جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے خواتین عرب کے شوقِ تجمیل و آرائش میں نامناسب افراط کو محسوس کیا، تو اسنے "تبرج جاہلیت" (یعنی عہد جاہلیت کی زینت و آرائش) کو ممنوع قرار دیا۔

عہدِ جاہلیت کا لٹریچر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتیں صرف اُون اور سوت ہی کا لباس استعمال نہ کرتی تھیں بلکہ مختلف رنگ کے دیبا و حریر بھی حسب استطاعت پہنتی تھیں اور جب کسی جگہ اجتماع ہوتا تھا تو بہترین لباس و آرائش کے ساتھ شریک ہوا کرتی تھیں۔ المنخل الیشکری لکھتا ہے:۔

الکاعب الحسناء ترفل فی الدمقس و الحریر

(نوجوان حسین لڑکی دیبا و حریر کا ملبوس پہنے ہوئے اترا رہی ہے)

کپڑوں کے زرین نقش و نگار کا حال سلمی بن ربیعہ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

والبیض یرفلن کالدمی فی الریط والمذہب المصون

ریط سے مراد ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہیں اور المذہب المصون سے زرین نقش و نگار رکھنے والے ملبوس اسی طرح کے ہزاروں اشعار عہد جاہلیت کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے وہاں کی عورتوں کی رنگینی طبع و تزئین و تجمیل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس وقت یوروپ میں خاص تقریبات کے وقت امیر گھرانوں کی عورتیں ایسے ملبوس پہنتی ہیں جن کے دامن فرش پر گھسٹتے رہتے ہیں اور غالباً یہی وہ وضع ہے جس کو فارسی میں "دامن کشاں گزشتن" سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم عربی عورتیں بھی بالکل اسی طرح کے لباس پہنکر مجالس و محافل میں شریک ہوتی تھیں جسے "جرِّ ذیول" کہتے ہیں اس فیشن کے متعلق مورخین عرب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اس کو جناب ابراہیم کی بیوی ہاجرہ نے وضع کیا تاکہ دامن کے گھسٹ کر چلنے سے اُن کے نشان قدم مٹتے جائیں اور اُن کی سوکن سارہ کو پتہ نہ چلے۔ اس کے بعد اور عورتوں نے بھی یہی وضع اختیار کی۔ چنانچہ عرب عورتوں کے اس طرح "دامن کشاں" چلنے کا ذکر کثرت سے وہاں کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ امرؤ القیس لکھتا ہے:۔

خرجتُ بہا امشی تجر وراءنا علی اثرینا ذیل مرط مرحل

اس شعر میں شاعر اپنی معشوقہ فاطمہ کا ذکر کرتا ہے کہ جب وہ خلوتگاہ سے نکل کر چلی اور عاشق بھی ساتھ ساتھ چلا تو وہ اپنے ملبوس کا دامن گھسیٹتی ہوئی گزری تاکہ دونوں کے نشان قدم مٹتے جائیں اور کسی کو پتہ نہ چلے۔

"مرط مرحل" سے مراد وہ ریشمی کپڑا ہے جس کے اوپر محمل کی تصویریں منقوش ہوں۔

یہ وضع عرب عورتوں میں بہت مقبول تھی اور عہد اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ لکھتا ہے:۔

کتب القتل و القتال علینا وعلی الغانیات جر الذیول

یوروپ کے عہد وسطےٰ کے بعد بھی عورتوں میں رسم تھی کہ وہ اپنے کولوں کو بڑا دکھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے گدے یا تکیے کمر سے نیچے دونوں طرف باندھ لیتی تھیں۔ اور پھر اس کے اوپر دوسرا ملبوس پہن لیتی تھیں۔

یہ وضع بھی عہد جاہلیت کی عورت نے اختراع کی تھی جسے عظامہ، حشیۃ اور رفاعۃ کہتے تھے اور اہل لغت نے اس کے معنی لکھے ہیں کہ وہ تکیے کی طرح کپڑے کی گدی ہوتی ہے جس کو باندھ کر عورتیں اپنے کولوں کو بڑا ظاہر کرتی ہیں۔

استعمال زیور میں وہاں کی عورتوں کو بہت شغف تھا اور لباس سے زاید اس طرف توجہ تھی۔ اور ایک ایک حصۂ جسم کے لئے متعدد زیور استعمال کرتی تھیں۔ مثلاً ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں، کلائی میں کنگن، بازو میں جوشن اور پہونچے میں دست بند استعمال کرتی تھیں جن کا نام علی الترتیب خاتم، سوار، دملج اور جبرۃ تھا۔ دست بند استعمال کرنے کی رسم بعد کو متمدن یورپ میں بھی جاری ہوئی اور اسوقت تک پائی جاتی ہے۔

انگوٹھیاں وہ دسوں انگلیوں میں پہنتی تھیں اور یہ رسم عہد اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب آغانی لکھتے ہیں کہ:-

"وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ معشوقہ (ثریا) کے پاس گیا اور جب وہ کپڑے اتار کر اسکے پاس آئی تو اسکے دوست کو دیکھکر لوٹ گئی۔ اس نے کہا کہ شرم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ میرا دوست ہے اور اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ کہکر وہ ہنسنے لگا۔ ثریا کو غصہ معلوم ہوا تو اس نے نکل کر ایسا دوہتڑ مارا کہ دسوں انگوٹھیوں کے نشان اسکی پیشانی پر پڑ گئے"

جب ظہور اسلام ہوا تو عورتوں کا یہ ذوقِ آرائش حد کو پہونچا ہوا تھا، قمیص کا گریبان کھلا رہتا تھا اور دوپٹہ پیچھے لٹکتا رہتا تھا جس سے سینہ و گردن دونوں عریاں نظر آتے تھے۔ اسلام نے اس وضع کو فتنہ سے خالی نہ دیکھکر حکم دیا کہ عورتیں اپنے دوپٹہ کا پلو سینہ پر دہرا لیا کریں۔ (ولا یبدین زینتہن الا لبعولتہن د آبا ہن)

اس حکم سے ان کو سخت صدمہ ہوا، لیکن چونکہ دینی روح ان میں پوری طرح رچ چکی تھی اس لئے سوائے تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر کچھ زمانہ بعد ایک اور وضع انھوں نے ایجاد کی جو ان کے گمان میں خلاف مذہب نہ ہو سکتی تھی، یعنی تنگ کپڑا استعمال کرنا شروع کیا جسے "وضع قباطی" کہتے تھے۔ ابن رشد نے لکھا ہے کہ قباطی ان تنگ و چست کپڑوں کو کہتے ہیں جو جسم کے نشیب و فراز اور اعضاء کے اتار چڑھاؤ کو نمایاں کر دیتے ہیں، خلیفۂ ثانی نے اس وضع کو بھی ممنوع قرار دیا کیونکہ اس میں بھی کافی عریانی تھی۔

عرب کی عورتوں کا ملبوس بعض مرتبہ شاعری سے بھی کافی متاثر ہوا ہے اس سلسلہ میں ایک ادبی واقعہ کا بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

خواتین عرب سیاہ رنگ کا ملبوس اور خاصکر سیاہ دوپٹہ پسند نہ کرتی تھیں۔ ایک بار عراق کا کوئی سوداگر مدینہ آیا جسکے پاس مختلف رنگوں کے دوپٹے تھے۔ یہاں پہونچتے ہی اس کا تمام مال فروخت ہو گیا لیکن سیاہ دوپٹہ کسی نے نہ لیا۔ سوداگر مسکین الدارمی کے پاس گیا جو اپنے زمانہ کا مشہور رنگین مزاج شاعر تھا اور کچھ دن سے مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہا تھا۔ مسکین کو اس پر رحم آیا اور خرقۂ زہد اتار کر مسجد سے باہر آگیا۔ اب اس کی وہی شان رندی تھی اور وہی ادائے رنگیں۔ اس نے چند شعر لکھ کر اپنے ایک دوست کو جو مغنی تھا دے تاکہ وہ کسی جگہ جاکر اُن کو سنا دے۔ وہ اشعار یہ تھے:-

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود ماذا فعلت براہب متعبد

قد کان شمر للصلاۃ ثیابہ　　حتیٰ خطرت لہ بباب المسجد
ردّی علیہ صلاتہ وصیامہ　　لا تقتلیہ بحق دین محمد[۱]

ان اشعار کا مدینہ میں مشہور ہونا تھا کہ گوشہ گوشہ تک یہ خبر پہونچ گئی کہ دارمی کسی سانولی لڑکی کے عشق میں جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے مسجد سے باہر آگیا ہے اور مدینہ کی کوئی ملیح لڑکی ایسی نہ تھی جو سیاہ رنگ کی اوڑھنی کی طرف مائل نہ ہو گئی ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوداگر نے بہت کافی نفع سے سیاہ رنگ کے دوپٹے فروخت کر دئے اور اسوقت سے سیاہ دوپٹوں کا رواج شروع ہو گیا۔

اس کے بعد سنہرے رنگ کے دوپٹوں کا رواج ہوا، جیسا کہ قاضی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو دارمی کے رنگ میں لکھے گئے تھے:-

قل للملیحۃ فی الخمار المذہب　　افسدت نسک اخی التقی المترہب
نور الخمار و نور وجہک تحتہ　　عجبا لوجہک کیف لم یلتہب
وجمعت بین المذہبین فلم یکن　　للحسن عن ذہبیہما من مذہب
واذا اتت عین لتسرق نظرۃ　　قال الشعاع اذہبی لا تذہبی

بالوں کی آرائش کے سلسلہ میں وہاں مناہرہ کا بھی رواج تھا جو عہد جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا اور عہد اسلام میں بھی عرصہ تک باقی رہا۔ مناہرہ کی صورت یہ تھی کہ بالوں کی مینڈھیاں گوندھکر سر کے اوپر اس طرح باندھ لیتی تھیں کہ خراسانی اونٹ کی دو کوہانوں کی طرح وہ حصہ دو جگہ سے بلند نظر آتا تھا۔ رسول اللہ نے اس سے بھی عورتوں کو باز رکھا کیونکہ اس وضع میں پہلے سر پر دوپٹہ وغیرہ پیشانی تک لپیٹا جاتا تھا اور اس سے صحت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔

بالوں کی ایک وضع جناب سکینہ بنت حسین کے نام پر "طرۂ سکینہ" کے نام سے رائج ہوئی۔ جناب سکینہ نہ صرف اپنے حسن و جمال بلکہ بالوں کی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ کی نہایت مشہور خاتون تھیں۔ آپ کو تزئین و آرائش کا خاص ذوق فطرت سے ودیعت ہوا تھا اور بالوں کی زیبائش میں آپ نے ایک خاص اختراع کی جسے "طرۂ سکینہ" کہتے ہیں۔ یہ وضع خواتین عرب میں بہت مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے نہایت سختی سے اسے رد کا۔

ایک وضع خلیفۂ مہدی کی بیٹی علیہ کے نام سے مشہور رہوئی۔ یہ نہایت حسین و جمیل تھی اور فن شعر و موسیقی کی بھی بڑی ماہر تھی، لیکن پیشانی بدنمائی کی حد تک وسیع و کشادہ پائی تھی، اس عیب کو چھپانے کے لئے اس نے جڑاؤ سر بند وضع کیا جس سے پیشانی

---

[۱] ان اشعار کا مفہوم یہ ہے:- اس سانولے رنگ کی لڑکی سے جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے جا کر کہو کہ یہ تونے ایک زاہد شب زندہ دار کا کیا حال کر دیا وہ تو اپنی تمام عمر عبادت دنیایش کے لئے وقف کر چکا تھا کہ ناگہاں تو نظر آگئی اور نماز و روزہ سب خاک میں ملا دیا۔ پھر تجھے اپنے دین و مذہب کا واسطہ، سچ بتا کیا تو اس کو واقعی قتل کر دے گی۔

ڈھک جاتی تھی یہ وضع اتنی مقبول ہوئی کہ جس عورت کو دیکھئے سر بند سے پیشانی کو چھپائے ہوئے ہے۔

بالکل اسی طرح فرانس کی ایک مشہور امیرزادی نے کیا جس کا نام (La Belle Ferronnière) تھا۔ اس کے وسط پیشانی میں آگ سے جل جانے کا داغ تھا۔ اس کو چھپانے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ داغ کی جگہ ہیرا رکھکر دونوں طرف ریشمی دھاگے سے باندھ کر سر میں لپیٹ لیا۔ اسپین کی ایک امیرزادی کی رانیں بہت موٹی تھیں اس نے ایک خاص لباس ایجاد کیا جس سے یہ عیب چھپا رہتا تھا، اسی طرح لوئی نہم شاہ فرانس کی ایک لڑکی کے پاؤں بہت بھدے تھے اور ان کے چھپانے کے لئے اس نے لانبا گون اختراع کیا جس کا دامن زمین تک لٹکتا رہتا تھا اور پاؤں کو چھپائے رکھتا تھا۔ بعد کو یہ اوضاع تمام ملک میں رائج ہوگئیں۔

دور عباسیہ ترقی تمدن اور تہذیب مجلس و معاشرت کے لحاظ سے اسلام کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اس قسم کی اختراعیں کثرت سے ہوئیں اور عورتوں کو اپنی تجمیل و تحسین کی طرف بہت توجہ ہوئی۔ علی ابن ہشام کی ایک کنیز (ریتم) تھی جو بے انتہا خوبصورت و وضعدار تھی۔ اس نے سر کی ٹوپی میں فیتہ باندھنے کی وضع ایجاد کی تاکہ سر کے تنیں۔ اور پھر یہ وضع عام ہوگئی۔ یہ کنیز ابن ہشام (اپنے مالک) کے قتل کا بھی باعث ہوئی، کیونکہ خلیفہ مامون نے یہ لونڈی علی ابن ہشام سے طلب کی تھی اور اس نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔

عہد بنی اُمیہ میں دستی پنکھوں میں اشعار لکھنے کا رواج عام تھا، لیکن عہد عباسیہ میں کپڑوں پر بھی عمدہ عمدہ فقرے اور اشعار لکھے جاتے تھے۔ کمر اور سر کی مرصع پٹیوں قمیص کے دامنوں اور ٹوپیوں وغیرہ پر بھی سونے کے ورق لگا کر اشعار نمایاں کئے جاتے تھے اور یہ ایجاد بھی عورتوں ہی نے کی تھی پھر یہ وضع صرف طبقۂ امرا ہی تک محدود نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی کنواریاں بھی اپنی چادروں، پٹیوں اور ملبوسوں میں اشعار منقوش کراتی تھیں۔ چنانچہ وشاؔر لکھتا ہے کہ میں نے کلیسائے مریم میں ایک کنواری کو دیکھا کہ چاند کی طرح ہیل باہر نکلی۔ اس کے کمر میں مرصع پیٹی تھی اور اس پر یہ اشعار منقوش تھے :-

زنارها فی خصرها لیطرب — وریحها من طیبها الحبیب

ووجهها احسن من حلیها — ولونها من لونها اعجب ۱؎

وضع کی ایجاد پر حوادث سیاسی اور انکشافات اثری بھی متاثر ہوا کرتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی عورتیں ہر تاریخی واقعہ کی یادگار اپنے کپڑوں پر منقوش کر لیا کرتی تھیں۔ جب آٹھویں ہجری میں سنگ مرمر کے دو ستون (عہد فاطمی کے) دریافت ہوئے تو عورتوں نے اپنے ملبوس کی تراش میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی جو طول میں دو ستونوں سے مشابہ تھی۔ بعد کو یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس کا نام جرالعمود پڑ گیا۔

۱؎ مفہوم یہ ہے کہ اسکی کمر کی پیٹی کتنی خوشنما ہے اور اس کے چہرہ کا حسن اُس کے زیوروں سے زیادہ جاذب نظر ہے۔

مصر کی عورتوں نے ایک اور وضع قمیض کی ایجاد کی جس کو بطلہ کہتے تھے اور چونکہ اس میں بہت زیادہ صرف ہوتا تھا اسلئے حکومت نے بمشکل تمام اس سے عورتوں کو باز رکھا۔ مقریزی کا بیان ہے کہ عورتیں اتنی بڑی بڑی قمیص بناتی تھیں کہ زمین تک لٹکتی رہتی تھی اور آستین تین تین گز کی ہوتی تھیں، ایک ایک ہزار درہم ایک قمیص پر صرف ہوجاتے تھے، پاجامہ یا ازار کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ وزیر منجک نے نہایت سختی سے اس کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ان کی آستینیں کاٹ دیں، انکے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بعض کو تو اس نے قتل بھی کرا دیا جب کہیں جاکر یہ رسم وہاں سے اٹھی لیکن اس کے مرنے پر چند دن بعد پھر اس کا رواج ہوگیا چنانچہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ۷۹۲ھ میں بڑی آستین والی قمیصوں کے خلاف پھر احکام جاری کئے گئے ۔ یہ آستینیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ہاتھ اٹھانے سے تمام گردن و شانہ، بلکہ سینہ اور پیٹ تک نظر آنے لگتا تھا۔

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف عہ میں اور غیر مجلد عہ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد للعہ میں اور غیر مجلد للعہ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۳۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

نیجر نگار لکھنؤ

دوزخ

(۱)

دریا چپ چاپ بہ رہا تھا — کتنا خاموش! کتنا غمگین!....

کنارے پر مکانات ایسے اُداس نظر آتے تھے، جیسے خستہ حال فقیروں کا گروہ، جنھیں ملاح نے کرایہ نہ رہنے کی وجہ سے روک رکھا ہو! — اپنے جھکے ہوئے کاندھے ایک دوسرے سے ملائے — اپنی لاغر ٹانگیں پانی میں پھیلائے! اُن کی کھلی ہوئی کھڑکیاں حقارت آمیز حسرت سے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے اکا دُکا اچھے مکانوں کو دیکھ رہی تھیں جو سبز سبز گھاس پر ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے مخملی فرش پر شمعدان —

ان غریب گھروں میں روشنی نہ تھی! — فسردہ خاموشی! خاموش تاریکی! تاریک اُداسی! — اور موجوں کی سسکیاں! جو آہستہ آہستہ، لاپروائی سے چلی جا رہی تھیں، ایک عالم خود فراموشی میں! زندگی کے بوجھ سے تھکی ہوئی!...

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ جھینگروں کی جھنجھناہٹ ہوا میں گونجی ہوئی تھی!... آبی پودوں سے ٹکرا کر یہ "نغمہ" غضب کا سحر انگیز ہو جاتا تھا! ہوا کے رُک رُک کر آتے ہوئے ہلکے ہلکے جھونکے کبھی کبھی پانی کی سطح سے گزر کر انھیں اُس کنارے بھی پہونچا دیتے!..

دور ایک کشتی آ رہی تھی!...

کنارے پر کے ایک مکان میں ایک عورت کھڑی تھی۔ کمزور، نحیف!.. کٹہرے پر جھکی ہوئی ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کئے کشتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ٹھیک جہاں پر کشتی تھی، آفتاب کی سنہری کرنیں پانی میں چمک رہی تھیں۔ گویا کہ کشتی سنہرے "آئینہ" پر پھسلتی چلی آ رہی تھی!...

شام کی روشنی میں اس عورت کا موم جیسا زرد چہرہ ایسا ہی چمک رہا تھا جیسی کہ خود اس کی روشنی تھی!.. دور سے ایسا صاف دکھائی دیتا تھا جیسے تاریک راتوں میں سمندر کی موجوں پر چمکتا ہوا سفید جھاگ! اس کی پُر خوف مایوس نگاہیں، مضطربانہ، کچھ تلاش کر رہی تھیں! اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ لیکن پیشانی کی شکنیں اس کی نا اُمیدی کو صاف ظاہر کر رہی تھیں!۔

گاؤں کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی!....

اس نے سر ہلانا شروع کیا گویا کہ وہ کوئی آواز سننا ہی نہیں چاہتی۔

"میں نہیں برداشت کر سکتی! میں نہیں برداشت کر سکتی!"۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی!

لیکن اذان کی صدا آتی ہی رہی!....

وہ صحن میں ٹہلنے لگی۔ اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ سانس زور زور سے آ رہی تھی۔ آنسو اُمڈے آ رہے تھے!

—— مدت سے اسے ایک تکلیف دہ مرض تھا۔ کتنے ڈاکٹروں کو اس نے دکھلایا۔ کتنی بڑی بوڑھیوں سے اس نے مشورہ لیا۔ ہزاروں منتیں مانیں۔ درگاہوں پر نذر نیاز کی۔ لیکن تکلیف کم نہ ہوئی۔ ذرا بھی آرام نہ ملا۔ اُٹھتے بیٹھتے کسی طرح بھی چین نہ ملتا! آخر کار ایک کانے بوڑھے نے اسے ایک ٹوٹکا بتایا۔ کہ ایک پوٹلی میں قبرستان کی گھاس، مرگھٹ کی خاک، کانچ کے ٹکڑے اور اپنے دو چار بال باندھ کر کسی تندرست، نوجوان عورت کی طرف جو بہتے پانی سے ہو کر اس کی طرف آ رہی ہو پھینکدے۔ تب اسکا مرض منتقل ہو جائے گا!——

اور اسوقت وہی جادو کی پوٹلی وہ آنچل میں چھپائے تھی!... اور سامنے کشتی آ رہی تھی!... جب سے اس نے پوٹلی باندھی تھی یہ پہلی کشتی تھی جو اس نے دیکھی!

وہ آکر کٹہرے پر جھک گئی۔ کشتی اب اتنی نزدیک تھی کہ اس کے آدمی صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سب کے سب اجنبی معلوم ہوتے تھے۔ اگلے حصہ پر ایک مرد کھڑا لگی سے کھے رہا تھا۔ سکان ہاتھ میں لئے ایک عورت بیٹھی تھی اور اس کے پاس ایک نوجوان تھا۔

بیمار عورت کٹہرے پر اور جھک گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ زرد چہرہ سُرخ تھا آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں! وہ کشتی کے نزدیک آنیکا انتظار کر رہی تھی!

آدمیوں کی گفتگو کی آواز اب آنے لگی۔ کبھی تو بالکل صاف۔ کبھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر۔

کشتی اب مکان کے سامنے تھی۔ ٹھیک اسوقت کسی نے دیاسلائی جلائی، روشنی، جھلملاتی ہوئی ایک عورت کے چہرہ پر پڑی۔ بچوں کا سا معصوم و شگفتہ چہرہ! ہونٹ تبسم میں کھلے ہوئے!... اتنا پیارا چہرہ! اتنا معصوم! اتنا خوش! وہ ابھی بالکل لڑکی تھی!...

روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی کوئی چیز کشتی کے نزدیک پانی میں گری اور کشتی گزر گئی!——

---

(۲)

ایک سال بعد——

بھاری، گہری، رنگین بدلیوں میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آسمان کی سرخی دریا کی ساکن سطح پر منعکس ہو رہی تھی۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جھینگر اور کیڑے خاموش تھے —— صرف موجوں اور آبی پودوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں!

دور ایک کشتی آ رہی تھی !...

وہی عورت دریا کے کنارے کھڑی تھی گزشتہ سال پوٹلی دوشیزہ کی طرف پھینکنے کے بعد وہ بیہوش ہو گئی تھی !... اسکے مستحکم اعتقاد نے ـــ اور شاید گاؤں کے نئے ڈاکٹر نے بھی ـــ اس کے مرض میں تخفیف کر دی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت اچھی ہوتی گئی اور آخر کار قریب قریب اسے صحت ہی ہو گئی ! اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ـــ لیکن خوشی دیرپا نہ تھی ۔ رفتہ رفتہ عجیب طرح کا غم اس نے محسوس کرنا شروع کیا ۔ رہ رہ کر اسے کشتی والی دوشیزہ یاد آتی ۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے لڑکی اس کے آگے ہاتھ جوڑے آنسو بھری حسین آنکھوں سے التجا کر رہی ہے ! وہ اکثر سسکیاں سنتی !... لڑکی زرد ! لاغر ! ہمیشہ اسے اپنی بڑی معصوم آنکھوں سے دیکھتی معلوم ہوتی !...

آج شام وہ کنارے پر آ گئی تھی ۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا ۔ بالو پر بیٹھی تھی ! رہ رہ کر اٹھتی ، ادھر ادھر نظر دوڑاتی ۔ اور پھر بیٹھ جاتی !...

مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی !....

اس نے ڈنڈا رکھ دیا گھٹنے ٹیک کر دعا مانگی ۔ پھر آگے بڑھی ۔ اور ... بغل بغل پانی میں جا کر اپنے کو گرا دیا !... موجوں نے اسے اپنی سرد گرفت میں پکڑا ، اپنی تاریک گہرائی میں اسے گھسیٹ لیا اور اسے لئے ہوئے آگے بڑھ گئیں !... چپ چاپ ! آہستہ آہستہ ! اُداس !... گاؤں سے پرے ! کھیتوں سے پرے !... دور ! بہت دور !...

کشتی اب بہت نزدیک آ گئی تھی ۔ گزشتہ سال کے وہی چھ مسافر تھے ۔ نوجوان سکان کے پاس بیٹھا تھا ۔ دوشیزہ کشتی کے بیچ میں کھڑی تھی ۔ ریشمی سرخ لباس پہنے ! ـــ دونوں کی شادی ہونے والی تھی !...

کشتی مکان کے پاس سے گزر گئی ۔ اس نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا !.. اس کے تبسم میں کتنی شیرینی تھی ! کتنی مسرت ! کتنی حلاوت !...

وہ گانے لگی .. اس کی آنکھیں رنگین بادلوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ گا رہی تھی ... ایسا مطمئن گیت ! ایسا پر سکون گیت ! مسرت سے چھلکتا ہوا ! خوشی سے مہکتا ہوا ! کامیابی سے سرشار !.....

(ماخوذ)　　　　　تمنائی !

تصحیح

جولائی کے نگار میں صفحہ ۵۰ کی آخری سطر میں بجائے ر ، ز ، ؤ کے حرف لم × چھپ گیا ہے قارئین درست کر لیں ۔ منیجر نگار

نغمۂ دل

یہ مجموعۂ کلام شاہجہاں پور کے مشہور اہلِ سخن جناب دلؔ کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے، کتاب کی ابتدا جناب نیاز فتحپوری کے ایک بسوط مقدمہ سے ہوتی ہے، جو ضرورت سے زیادہ طویل ہے، اس کے بعد جناب عزیزؔ لکھنوی کا ایک تبصرہ ہے جو اسی قدر مختصر ہے، پھر غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور آخر میں چند متفرق اشعار، رباعیات اور مخمس ہیں۔

غزلیات کی ترتیب افسوس ہے کہ اسی قدیم طرز پر یعنی ردیف وار رکھی گئی ہے، اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا یعنی ابتدا میں کلام کا کیا انداز تھا، اور رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لائق مصنف نے قدیم اور جدید کا فرق دکھانے کی غرض سے غزلوں پر "ق" اور "ج" لکھ دیا ہے، لیکن اس سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ شروع میں قدیم کلام بلالحاظ ردیف درج کر دیا جاتا، اس کے بعد جدید غزلیں یکجا جمع کر دی جاتیں، اور غزلوں کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے رکھی جاتی، اس طور پر کلام کے ارتقاء تدریجی کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔

علاوہ اس کے اگر ضخیم دواوین و کلیات کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو یہ زیادہ مفید اور بہتر ہوگا، شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا، بلکہ کیا کہا، اور کیسا کہا؟ اور نہ ضروری ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ سب شائع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ لائق مصنف نے انتخاب سے کام نہیں لیا، ورنہ ان کے کلام کی رونق دوبالا ہو جاتی

اگرچہ فرصت کی کمی کی وجہ سے ادبی مشاغل کا سلسلہ ایک مدت سے بند ہے، تاہم یہ سخت ناانصافی ہوگی، اگر اس قسم کے قابلِ قدر کلام سے اعتنا نہ کیا جائے، موجودہ حالات میں تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں، البتہ دیوان کے سرسری مطالعہ سے جناب دلؔ کی خصوصیاتِ کلام کے متعلق جس حد تک اندازہ کر سکا، اس کو مختصراً حوالہ قلم کرتا ہوں۔

جناب دلؔ کا خاص صحیفۂ سخن غزل ہے، عام طور پر غزل گوئی نہایت آسان چیز سمجھی جاتی ہے، اگر صرف زلف و کمر، خط و خال، ناز و ادا وغیرہ کی مصوری کا نام غزل ہے تو بے شبہ ہر بوالہوس غزل گوئی کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن واقعہ

یہ ہے کہ اس سے زیادہ نازک اور مشکل اور کوئی صنفِ سخن نہیں، ہر شخص عشق و محبت کی نزاکتوں کا اندازہ شناس نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ذوقِ صحیح اور فطرتِ سلیم کی ضرورت ہے، جو ہر انسان کا حصہ نہیں۔ ع ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اس بنا پر ایک غزل گو شاعر کے کلام میں سب سے پہلے جس چیز کو میری نگاہ ڈھونڈھتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر نے اپنے آئینۂ محبت کو کس حد تک ابتذال کی گرد سے پاک و صاف رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نے جس ہستی کو اپنا محبوب نظر بنایا ہے، اس کی حیثیت صرف ایک بازاری فتنہ گر کی ہے یا اس میں کچھ لطیف معنوی محاسن بھی ہیں، ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے، جناب دل نے آنکھیں کھولیں تو ملک پر امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا، زانوے تلمذ بھی جناب دل نے انھیں کے سامنے تہ کیا، لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبعِ سلیم عطا ہوئی تھی، اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا، جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے، تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے، نیاز صاحب ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے، اور کسی ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ نہ ملے تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھولے سے بھی اس (آرام جان) جلنِ تمنا کا ذکر نہ آئے،،

مجھکو جناب دل کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعوے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا یہ منشا ہے کہ جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں، جو مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعرا کے سرمایہ خیال ہیں، مثلاً شمع تربت، چراغ مزار، بت سفاک، گریہ و زاری، ناز و ادا، کوچۂ قاتل، گورِ غریباں، وغیرہ ان کی جھلک جناب دل کے کلام میں بھی نظر آتی ہے، اور یہ اثر زیادہ تر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے مثلاً

دل صد چاک ہیں دیکھا رخِ روشن ان کا　　ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا
اور آشفتہ تہ خاک کرے گا ہم کو　　بال کھولے ہوئے آنا سرِ مدفن ان کا

ہاتھ دل پر رکھ کے یہ کہنا کسی کا یاد ہے　　اب اسے اپنا نہ کہنا یہ ہمارا ہو گیا
جوڑا اچھا ہے مری تقدیر ان کی زلف کا　　یہ بھی بل کھائی ہوئی ہے وہ بھی بل کھائی ہوئی
چھری رکھکر گلے پر کاش قاتل آفریں کہتا　　ہمارے ذبح کرنے کے لئے تکبیر ہو جاتی
ترا کوچہ ہے یا دار الشفا اے غیرتِ عیسیٰ　　ادھر بیمار بیٹھے ہیں ادھر بیمار بیٹھے ہیں
کھینچو چھری نقاب الٹ کر عتاب میں　　چینِ جبیں کو چین نہیں ہے حجاب میں

وقت خود بینی نہ دیکھیں آپ ننگر آئینہ — ہر ادائے حُسن پر کھینچے گا خنجر آئینہ

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں، لیکن دو شعر اور ملاحظہ ہوں :-

ہوا سنکی، گھٹا چھائی، چمن میں پھر بہار آئی — تمنا ہے کہ وہ گُل پیرہن پہلو نشیں ہوتا

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا سماں، یہ کیفِ بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعویٰ پر قائم ہیں؟ کیا پہلے شعر میں "اسی آرام جان کی تمنا" کا ذکر نہیں ہے، دوسرے شعر کا مصرع ثانی اگر وصل نہیں، تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟

ان مثالوں سے صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ جناب دلؔ کا کلام لکھنویت سے بالکل محفوظ نہیں ہے اور یہ اُستاد کے فیضِ صحبت کا لازمی نتیجہ تھا، لیکن چونکہ فطرت متین اور ذوق آشنا تھی، اس لئے جناب دلؔ اس حمام میں عام لکھنوی شعراء کی طرح بالکل برہنہ نظر نہیں آتے، اور کہیں کہیں اسی قدیم ذخیرۂ سخن میں ذوقِ سلیم کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے، جس نے آئندہ چل کر ان کے آئندہ کلام کو لکھنویت کی آلائش سے اس حد تک صاف کر دیا کہ پڑھنے والے کو کبھی یقین نہیں آسکتا، کہ یہ لکھنؤ کے کسی صحبت یافتہ کا کلام ہے، قدیم غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

وہی مستِ حقیقی ہے جو ہم بزم ساقی میں — شکستِ شیشۂ دل کی صدا پر وجد کرتا ہو

بڑھیں دل دینے والے خود بخود جوشِ محبت میں — سرِ پرناز پریوں حُسنِ دلکش جلوہ آرا ہو

دلیل عشق صادق سوزِ پنہاں ہو نہیں سکتا — جلے جو شمع کی لو میں اُسے پروانہ کہتے ہیں

ذوقِ جانبازی میں یہ احساس تک آتی نہیں — دل میں پیکاں رہ گیا یا دل کو پیکاں لے چلا

خاموش دلِ زار تہِ خنجرِ قاتل — شکووں کا ہے یہ وقت کہ تسلیم و رضا کا

گو نذرِ فنا ہو گئی پروانوں کی ہستی — روشن ہے مگر نام شہیدانِ وفا کا

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں، جن سے جناب دلؔ کی سلامتِ مذاق کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے ہم کو جناب دلؔ کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے، یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے، جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :-

حسرت کا ہے نمونہ رنگِ تغزل اپنا — ہم انتہائے غم کی تصویر کھینچتے ہیں

اگرچہ فطری متانت اس موقع پر بھی قائم رہتی ہے، یعنی عام لکھنوی شعراء کی طرح جناب دلؔ علانیہ سینہ کوبی اور نوحہ گری کی حد تک نہیں پہونچے تاہم اُنھوں نے غم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ لکھنویت کے اثر سے بالکل محفوظ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ مثالوں

سے بخوبی ہو سکتا ہے،

شبِ غم کی مصیبت بھی قیامت زا مصیبت تھی ۔۔۔ یہ عالم تھا کہ اب نکلا مگر نکلا نہ دم میرا
جگر پھر کیوں نہ دوں لے جوش گریہ تجھکو آنکھوں میں ۔۔۔ شبِ ہجراں لبوں تک تو ہے شرکیب رنج و غم میرا
عشق کا انجام حسرتناک ہے اے اہلِ دل ۔۔۔ مٹ گئی ہر آرزو اک نقش دل پر رہ گیا
دل بھی مٹ جاتا تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں ۔۔۔ رہنے والا کون ہے کس کے لئے گھر رہ گیا
مصیبت در مصیبت میں ہوں ضبطِ غم سے اے ہمدم ۔۔۔ ٹپکتا ہے مرے ہر زخمِ دل سے نوحہ گر ہونا،
غمِ پیہم سے گھبرا کر گریباں چاک کرتے ہیں ۔۔۔ اسی کو ہم سمجھتے ہیں شبِ غم میں سحر ہونا
مبارک ہو تجھے او ناشناسِ شانِ خودداری ۔۔۔ مری بزمِ عزا میں بیٹھ کر اب نوحہ گر ہونا
سینہ شق ہے، رنگ فق، دل مضطرب، چشم اشکبار ۔۔۔ ایک ضبطِ آہ سے افسوس کیا کیا ہو گیا
عشق میں ایسی ٹھوکر کھائی آس کا شیشہ ٹوٹ گیا ۔۔۔ روز نئے دکھ سہنے سے اے ہمدم جی چھوٹ گیا
اس گریۂ پیہم کی وہ ساعتِ آخر ہے ۔۔۔ جس وقت مرا دامن آنکھوں سے جدا ہوگا
کب تک شبِ غم کوئی بدلتا رہے پہلو ۔۔۔ تسکین کی صورت نہ ادھر ہے نہ اُدھر آج
کافی ہے مرمٹوں کے لئے داغِ بیکسی ۔۔۔ روشن رہے یہ شمع ہمارے مزار پر
زینتِ دل ہیں نہ ارمان نہ شوقِ اُمید ۔۔۔ گھر ہے اُجڑا ہوا اس میں کوئی ساکن ہی نہیں
کسی کے ہجر میں ہم یوں بحالِ زار بیٹھے ہیں ۔۔۔ کہ چہرہ زرد ہے، لب خشک ہیں رخسار بیٹھے ہیں
جوشِ نشاط کیسا دل سرد ہو رہے ہیں ۔۔۔ عبرت کا ہے نمونہ افسردگی ہماری

اس قسم کے اور اشعار بہ کثرت موجود ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دلؔ کی طبیعت پر یاس و حسرت کا رنگ زیادہ غالب ہے، لیکن اتنا غنیمت ہے کہ ماتم سرایانِ لکھنؤ کی طرح جنازہ بردوش نظر نہیں آتے، بلکہ اکثر درد عشق کی بلند اور پاکیزہ اداؤں کی جھلک ان کے کلام میں محسوس ہوتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

نشترِ غم اہلِ ہوس کے لئے پیامِ مصیبت ہے، لیکن جناب دلؔ کے لئے اس کی خلش روح کی تازگی کا سرچشمہ ہے،

روح تازہ ہو گئی اللہ رے ذوقِ خلش ۔۔۔ دل کا ٹکڑا بن گیا دل میں جو نشتر رہ گیا

عشق صرف ایک سطحی اور عامیانہ جذبہ نہیں ہے، بلکہ ایک رازِ عمیق ہے، جس کا اندازہ مشکل ہے۔

بارہا ڈوب کے اُبھرے مرے دل سے نشتر ۔۔۔ راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

نشۂ عشق پیمانہ و ساغر کا محتاج نہیں ہے۔

جو مست حقیقی ہیں خمخانۂ اُلفت میں — ان کو کبھی پیمانہ درکار نہیں ہوتا

عشق کی اصلی شان خاک ہونے پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

خاک ہو جانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دل — جل گیا پروانہ لیکن رنگِ محفل بن گیا

محبوب کے فیضِ نگاہ کا خیر مقدم ان الفاظ میں کرتے ہیں،

اے نگاہِ روح پرور آفریں صد آفریں — جانِ بسمل بن گیا، وہ درد پیدا کر دیا

کاش یہ صدائے آفریں کبھی ماتم کدہ لکھنؤ سے بھی بلند ہوتی!

عشق کا تقاضا گریہ و بکا نہیں، بلکہ پر سکوت سوز و گداز ہے

صورتِ شمع جل خموشی سے — ہے تقاضا عشق سوز و گداز

ارباب ہوس تسکین و راحت کے طلبگار رہتے ہیں، لیکن ایک نکتہ دانِ محبت اس رمز سے واقف ہے کہ دراصل اضطراب ہی زندگی کی روح ہے۔

درحقیقت مضطرب دل کیلئے وہ موت تھی — اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

عشقِ حقیقی جوش کا طالب ہے، صرف زبانی شور و غل بے سود ہے،

مثالِ نعرۂ منصور جوش پیدا کر — عبث ہے شور انا الحق جو حکم دار نہ ہو

عاشق میں استعداد و صلاحیت ہے، تو معشوق کی نگاہ کرم خود بخود اُٹھ جاتی ہے، تقاضا پاسِ ادب کے خلاف ہے،

ان کی نظر کبھی تو اُٹھے گی پئے کرم — حُسنِ طلب یہی ہے، تقاضا نہ کیجئے

عشق میں ناکامیوں سے گھبرانا نہ چاہئے،

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی — کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجئے

ذوقِ نیاز عشق کی فطرت ہے اس لئے اس کو دوست کی بے اعتنائی کا گلہ مند نہ ہونا چاہئے،

سنگِ درِ حبیب کو حس نہ سہی قبول کی — فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نیاز میں

آہ و فریاد عشق کی رسوائی کا نشان ہے۔

آہ سینہ میں گھٹے اُف نہ زباں سے نکلے — درد اس حد سے گزر جائے تو رسوائی ہے

درد دل کا انیس اور پریشانی دل کی تسکین کا سرمایہ ہے۔

درد کی شان یہی ہے کہ رہے مونسِ دل دل کی تسکین یہی ہے کہ پریشاں ہو جائے

عاشق کو جان دینا چاہئے، لیکن بستر پر کروٹیں بدل کر نہیں، بلکہ اس طرح کہ محبت کا نام روشن ہو جائے۔

کوچۂ یار میں مٹنا مگر اک شان کے ساتھ خاک ہونا تو محبت کا نشاں ہو جانا

عاشق کی اصلی زندگی راہ وفا میں اپنے کو قربان کر دینا ہے،

ہر ذرہ خاکِ دل کا اک روحِ مستقل ہے مٹنا رہِ وفا میں ہے زندگی ہماری

اہلِ ہوس کے معشوق کی منزل لبِ بام سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن جناب دلؔ کے محبوبِ نظر کا مقام لبِ بام کیا عرشِ بریں سے بھی بلند تر ہے۔

کہئے تو کہہ دوں عرشِ بریں کو مقامِ دوست ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

عام شعرا معشوق سے جس بے باکانہ طریقہ پر اپنی تمناؤں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن جناب دلؔ کی آرزو اس قدر نازک اور لطیف ہے کہ نگاہ شوق بھی اس کو ادا نہیں کر سکتی۔

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے

عاشق کی حقیقی شمعِ راہ صرف اس کے دل کی آشفتگی اور ذوقِ جنوں کی سرمستی ہے، جو بلا کسی ہمدم یا رہبر کی اعانت کے عشق کی تمام دشواریوں کو آسان بنا دیتی ہے۔

ہمدم کی نہیں حاجت رہبر کی نہیں پروا آگے ترے وحشی کے آشفتگیِ دل ہے

افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم کو صرف انھیں چند مثالوں پر قناعت کرنا پڑتا ہے، لیکن ان مثالوں سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ جناب دلؔ صرف بُتِ بیدرد، اور قاتلِ نخوت پسند کی فسوں سازیوں کے اسیرِ دام نہیں ہیں، بلکہ عشق و محبت کی لطیف اداؤں کے بھی محرم راز ہیں، ان مثالوں سے ان کے کلام کی اخلاقی اور روحانی بلندی کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے یعنی ان کا عشق ہوس پرست شعرا کا عشق نہیں، جو بزدلی، پست خیالی، کم ہمتی، بے غیرتی اور نفس پرستی کی مجسم تصویر ہوتا ہے، بلکہ وہ عشق ہے جس کی فطرت صدق و وفا ہے، خلوص و ایثار جس کی سرشت ہے، جو ضبط و استقلال کا مجسمہ ہے جو موت کو زندگی سمجھتا ہے، جو خوددار، جانباز اور سرفروش ہے، جو شجاعت و تہور کا درس آموز ہے جو تسلیم و رضا کا لذت شناس ہے جو سراپا ذوق شہادت سے لبریز ہے، جو ناکامیوں کی ٹھوکریں کھا کر بھی سرشار آرزو رہتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے کیا جانے کس خیال سے دامانِ آرزو

خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے مرنا وفا میں آج شہیدانِ آرزو

اس کا نام محبت کی بے تابی ہے،

آساں نہیں مشاہدۂ حُسنِ جانگداز اس انجمن میں ہمتِ پروانہ چاہیئے

یعنی عشقبازی ہر بوالہوس کا کام نہیں، اس کے لئے صبر و ہمت اور ایثارِ نفس کی ضرورت ہے۔

وہ کیا گھبرائے اے ہمدم خرامِ حشر پرور سے کہ جس کے شیشۂ دل کی ہے زینت چور ہو جانا

عشق اسی بلند حوصلگی کا طالب ہے۔

حُسن کی عالم فریبی گو بہت مشہور ہے ہم مگر ایمان لائے روئے جاناں دیکھ کر

یہی وہ "روئے جاناں" ہے جو در اصل اربابِ ذوق و نظر کی پرستش کا مستحق ہے، وہ حُسن کیا، جو عاشق کے روحانی احساسات کو منور نہ کر دے، اور وہ عشق کیا جس میں اتنی بھی لطافت و صلاحیت و استعداد نہ ہو!

کاش ان کی رہ گزر میں پیوندِ خاک ہوتے کچھ زندگی نہیں ہے یہ زندگی ہماری

عشق اسی جذبۂ فنا اور ذوقِ ایثار کا متمنی ہے نہ کہ بستر پر کراہنے اور رونے اور چلانے کا!

امثال مذکورۂ بالا سے جناب دلؔ کے کلام کی معنوی عظمت، پاکیزگی، اور بلندی کا اب تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو، ضرورت تھی کہ دورِ حاضر کے دیگر غزل گو شعراء سے جناب دلؔ کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، اس وقت ان کے کلام کی خوبیاں اور زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتیں، لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے تفصیلی موازنہ کے لئے ہمارے پاس کافی وقت نہیں، ہم کو صرف اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ہے کہ جہاں تک عشق و محبت کے اخلاقی پہلو کی پاکیزگی اور خیالات کی شائستگی کا تعلق ہے جناب دلؔ اپنے عام معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ممکن ہے کہ ایک نکتہ سنج نگاہ کو جناب دلؔ کے آئینۂ سخن میں دقیق مسائل اور حکیمانہ اسرار کے جلوے نظر نہ آئیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت نے ان کو ایک ذوق آشنا قلب عطا کیا ہے، چنانچہ اکثر ان کے اشعار میں بادۂ تصوف کی مستی نظر آتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

صوتِ سرمدی کائنات کے ہر ذرے میں ترنم ریز ہے، اس کے لئے کسی مقام کی تخصیص نہیں، صرف گوشِ دل کے وا ہونے کی ضرورت ہے۔

گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

کثرتِ نور بھی مانعِ نظارہ ہوتی ہے۔

کثرتِ تنویر آخر بن گئی وجہ حجاب پردہ اُٹھنے پر بھی اک پردا نظر آیا مجھے

رازِ عشق کی لطافت عوام کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے، اس لئے اس کا اعلان غلطی اور خلافِ مصلحت ہے۔

حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور　　تھیں چھپانے کی جو باتیں وہ بہ آواز کہیں

گو جمالِ حقیقت نگاہوں سے مخفی ہے، تاہم کائنات کا کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا۔

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا　　ذروں میں کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا

جمالِ حقیقی کے بندۂ عقیدت کو دشت و صحرا کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں۔

جو مرجعِ عالم ہے اسی در کی طلب ہے　　کیوں دشت نوردی کرے دیوانہ کسی کا

انسان کی حقیقت ترکیبِ عناصر سے بلند تر ہے۔

گم اپنی حقیقت ہے ترکیبِ عناصر میں　　یہ پیرہنِ ہستی پردہ نظر آتا ہے

عشق جس قدر جلوۂ حسن سے قریب ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس کی بیخودی اور وارفتگی بڑھتی جاتی ہے اور جس قدر بیخودی بڑھتی ہے اسی قدر در اصل دوری ہوتی جاتی ہے، کیونکہ بیخودی کے عالم میں احساسِ قرب قائم نہیں رہ سکتا

محوِ جمال بے خود و مخمور ہو گئے　　یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

پرستارانِ حقیقت کفر و ایماں کی باہمی جنگ آرائیوں سے ہمیشہ بے تعلق رہتے ہیں۔

دنیائے حقیقت میں آزادِ تعین ہیں　　ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بتخانہ

ایک پوری غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

وہ حسنِ مطلق ہی جلوہ افگن ہے نور جس خوش ادا کو دیکھا　　عجیب قدرت کے ہیں کرشمے جدھر نظر کی خدا کو دیکھا

جو ڈوب کر پھر کبھی نہ ابھرا ہوا وہی آشنائے ساحل　　بقائے دائم کا اک مرقع غریقِ بحرِ فنا کو دیکھا

اسی کا نقشہ جما ہوا ہے، اسی کی اب لو لگی ہوئی ہے　　نظر میں عالم تھا بے حقیقت جب اس خدا آشنا کو دیکھا

مشاہدہ ہو تو کس طرح ہو بصارتِ ظاہری ہو عاجز　　گزر گیا جو خودی کی حد سے اسی نے ہیں خود نما کو دیکھا

خبر نہیں انتہا کی ہم کو کیا ہے گم بیخودی نے اے دل　　قدم جو رکھا رہِ طلب میں تو دور تر رہنما کو دیکھا

ان مثالوں کے بعد جناب دلؔ کے جذبۂ عشق کی لطافت اور حقیقت شناسی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

جناب دلؔ کی پاکیزہ خیالی تم نے دیکھ لی، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے احساس کا کیا عالم ہے؟ یعنی ان میں تڑپنے اور تڑپانے کی قابلیت کس حد تک ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں محض لفظی طلسم آرائی ہے یا اس میں کچھ سوز و اثر بھی ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک یہی چیز تغزل کی حقیقی روح ہے، بغیر اس کے ایک غزل گو شاعر کے تمام تخیلات بے کار ہیں، بدقسمتی سے لکھنؤ کی

بدولت سوز و گداز کا مفہوم گریہ و بکا سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ سوز و گداز کو دراصل سینہ کوبی اور فریاد و ماتم سے کوئی تعلق نہیں، یہ صرف روح کی ایک لطیف و دردمندانہ کیفیت کا نام ہے، جس سے شاعر کا کلام عام طور پر لبریز ہوتا ہے، اس حیثیت سے جناب دل اپنے عام معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں، یعنی ان کا کلام صرف ضعف، بے حسی، اور موت کا افسانہ نہیں ہے، بلکہ اپنے اندر احساس کی کافی گرمی اور زندگی کی روح رکھتا ہے اس کا اندازہ اشعار مذکورہ بالا سے بھی ایک حد تک ہو سکتا ہے، اس موقع پر چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:۔

یہی ہیں سوزِ دل عندلیب کے معنے
قفس تو پھونک دیا چند پر نہیں نہ سہی

یہی وہ ایثار کا شریفانہ احساس ہے جس میں روحِ انسانی کی حقیقی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

یہ قفس کیا قفسِ تن کے بھی ٹکڑے اُڑ جائیں
ہم سے اتنا کوئی کہدے کہ بہار آئی ہے

احساس کی شدت اور وارفتگی کی کتنی صحیح تصویر ہے!

موت کے ساتھ اہلِ ہوس کی دُنیائے محبت ختم ہو جاتی ہے، لیکن ایک ذوق آشنا اور دردمند روح کی سعی طلب کا آغاز فنا سے ہوتا ہے۔

مٹا کے ہستی دل صرف مدعا کرتے
یہیں سے سعی طلب کی ہم ابتدا کرتے

صحرائے محبت کا ہر ذرہ تسکین و راحت کا مرکز ہے، اس لئے ایک لذت شناس دیوانگی کا دل منزل کی تلاش و حسرت سے بے نیاز ہوتا ہے۔

جو ذرہ صحرا ہے، وہ ہے مرکز تسکین
پابند جنوں حسرتِ منزل نہیں رکھتا

عشق اپنے اندر خود ایک مستقل مستی اور زندگی کی روح رکھتا ہے، اس کو شراب و ساقی کی ضرورت نہیں۔

رہیں گے مست ہمیشہ شراب ہو کہ نہ ہو
ملے تو ہمت ساقی اگر نہیں، نہ سہی

نشترِ عشق کی کاوش تو اہلِ ہوس کے لئے ہمیشہ ایک مستقل مصیبت اور اذیت کا سامان ہے، لیکن صاحب ذوق کیلئے بالآخر سرمایہ راحت بن جاتی ہے۔

کاوش پیہم بالآخر ہو گئی لطف آفریں
اب وہ نشتر راحت دل ہے، جو خوں آشام تھا

پردۂ حسن اُٹھتا ہے، پھر بھی طالب جمال محروم نظارہ ہے، کیونکہ وہ اس حد تک جوشِ تمنا سے مست اور سرشار ہو جاتا ہے کہ اس کا احساس نظر جاتا رہتا ہے۔

گو پردہ اُٹھا پھر بھی حیراں ہوں کدھر دیکھوں
احساس نظر گم ہے اب جوشِ تمنا سے

ذوقِ جنوں کی شدت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

ہم شدتِ جنوں میں یوں خاک اُڑا رہے ہیں
صحرا پہ چھا گئی ہے آشفتگی ہماری

یہ بالکل مبالغہ نہیں ہے، ہمارے نزدیک اگر احساسِ محبت میں اتنی بھی شورشِ مستانہ نہ ہو تو وہ عشق کس کام کا اب ہم چند اور اشعار بلا کسی تشریح کے نقل کر دیتے ہیں، جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دل اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں اور ایک غزل گو شاعر کے لئے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

ہم مستِ عشق ہیں ہمیں ساغر سے کیا غرض
ساقی کی چشمِ مست ہماری نظر میں ہے

ہے نقش ذرہ ذرہ پہ جوشِ سرِ نیاز
کون آج سجدہ ریز تری رہ گذر میں ہے

اُٹھے تو محوِ تمنا، لے تو غرقِ حیا
نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

وہ خدنگ روح پرور ہے جزو دل جو لے دل
تجھے اضطراب کیوں ہو، مجھے انتشار کیوں ہو

نظارہ سوز شمع تجلی سہی مگر
تقلید گرمجوشیِ پروانہ چاہئے

ریاضِ دہر میں ہر شاخ و گل سے لطف اُٹھا
یہ شکل ساعد ساقی کی ہے وہ ساغر کی

اُٹھے نگاہ ڈھلے بادۂ نشاط افزا
کہ آرزو ہے اسی کیف روح پرور کی

تڑپ تڑپ کے یہ کہتے تھے کشتگان نگاہ
سکونِ قلب ہے جنبش کسی کے خنجر کی

مٹنے پہ بھی ہے دل کا وہ عالم کہ الاماں
دنیا ہر ایک ذرے میں آباد ہو گئی

دل تھا وہ دل جو خاک ہوا راہِ عشق میں
اکسیر تھی وہ خاک جو برباد ہو گئی

دامانِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے
آیا ہوں اک تلاطم دریا لئے ہوئے

آئی بہار حاصل دنیا لئے ہوئے
ہر شاخ گل ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

ابتک ہیں جوشِ عشق کی ہنگامہ خیزیاں
اُٹھا غبار قیس تو صحرا لئے ہوئے

ہر اشک خوں کو دیکھ رہا ہوں محیطِ غم
قطرے مری نظر میں ہیں دریا لئے ہوئے

ان اشعار کو پڑھو، کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک زندہ اور کیف آشنا روح آتش فشانی کر رہی ہے۔

ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بارگاہِ حسن کا ادب شناس ہو اور اپنی ہستی کو رضائے محبوب پر وقف کر دے، اس کو انتہائی جوشِ دیوانگی کے عالم میں بھی یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس کی حیثیت صرف ایک طالب کی ہے، جس کا کام صرف نیاز و عقیدت ہے، جناب دل کے کلام میں یہ جذبہ خاص طور پر محسوس ہوتا ہے

چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

راہِ طلب میں جوشِ عقیدت کی شرط ہے — ہو سجدۂ نیاز ہم آغوشِ نقشِ پا

ایک دوسری جگہ اسی شریفانہ جذبہ کو یعنی ظلم و ستم تو حُسن کی عادت ہے، لیکن عشق کا فرض یہی ہے کہ رشتۂ وفا ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے" اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہر تمنا امتحانِ عشق میں ہو صرفِ جور — اے وفا، دل یہ تیرا فرض ہو، وہ خوئے دوست

حُسن کی محشر خرامیوں کے سامنے جناب دلؔ کے نیاز عشق کی یہ شان ہے،

اٹھیں اس شان سے چلنا کہ اک ہنگامہ برپا ہو — ہمیں ہر گام پر اے ہم نفس آنکھیں بچھا دینا

اس سے زیادہ اور کیا عقیدت کا جوش ہو سکتا ہے، لیکن نہیں ان کا جوشِ نیاز اس سے بھی آگے بڑھ کر اس حد تک پہونچا ہے کہ بجائے محبوب کے سنگِ در ہی سے اپنا اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

بس انتہا ہے کہ سنگِ در حبیب سے ہم — بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے

جوشِ عقیدت کی واقعی یہ انتہا ہے۔

وہ ہزاروں ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن ان کے ذوق سرفروشی اور پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔

کسی کے عشق میں اب تک وہی ہے جوشِ جانبازی — ہزاروں ٹھوکروں پر بھی رہا ثابت قدم میرا

کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ جس سر نے آستانِ یار چھوڑ دیا اس کی قسمت میں حوادثِ آسمانی کی ٹھوکریں کھانا ہے۔

ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہے سنگِ حوادث کی — وہ سر جو تیرے سنگِ آستاں سے دور ہو جائے

ایک دوسری جگہ اپنے ذوقِ نیاز کا اظہار ان سادہ لیکن موثر الفاظ میں کرتے ہیں۔

ہم کو ان سے بے غرض دنیا ہوئی اپنی تو کیا — وہ اگر نامہرباں ہوں مہرباں کوئی نہ ہو

محبوب کے جور و ستم کو جس نگاہ عقیدت سے دیکھتے ہیں، وہ حقیقت میں جناب دلؔ کی صحیحتِ مذاق کی ایک روشن دلیل ہے، وہ اس راز سے واقف ہیں کہ محبوب کا جور و ظلم ہی در اصل اس کا لطف و کرم ہے، اس لئے وہ کسی قسم کی شکوہ طرازی کو آداب عشق کے خلاف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

جور و جفائے یار کا شکوہ نہ کیجئے — عشق وفا سرشت کو رسوا نہ کیجئے

اور ان کو اس ننگ کا احساس یہاں تک ہے کہ مرجانا گوارا ہے، لیکن شکوہ سنجی کی ذلت پسند نہیں،

خلاف عشق ہو سرگرم فریاد و فغاں ہونا الٰہی اس سے پہلے بند ہو جائے زباں میری

درد اُٹھتا ہے تو مسرت سے اچھل پڑتے ہیں کہ یہ کسی دلنواز کا پیام کرم ہے،

جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اچھل پڑے سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

ان کے نزدیک جوشِ محبت کا تقاضا یہی ہے کہ پیکانِ ستم جہاں تک ممکن ہو ذوقِ خلش کو بڑھاتا رہے۔

خلش افزا رہے پیہم یہ تحریک محبت ہے ملے پہلو میں گنجائش جہاں تک نوکِ پیکاں کو

خنجر قاتل سے جناب دل کو جو ذوق اور شیفتگی ہے اس کی تسکین صرف ایک وار سے نہیں ہو سکتی، چنانچہ آرزو ہے کہ دل کے ٹکڑے پھر کسی طرح باہم مل جاتے اور ذوقِ شہادت کی لذت ایک مرتبہ اور نصیب ہوتی۔

الٰہی اے چارہ گر باقی ہے ذوقِ خنجرِ قاتل کسی تدبیر سے پھر پارہ ہائے دل ملا دینا

نگاہ محبوب سے ناوک اندازیوں کا تقاضا ان الفاظ میں کرتے ہیں

اے نگاہِ قدر انداز چلیں یوں ناوک جزوِ دل ہو کوئی پیوست رگ جاں کوئی

کاش یہ ولولہ ان "بیمار دلوں" میں بھی پیدا ہو جاتا جن کو اب تک نوحہ خوانی سے فرصت نہیں!

ذوقِ ستم کی لذت شناسی ان کو اپنے زخم خوردہ دل سے تیر کے ٹکڑوں کے نکالنے کی اجازت نہیں دیتی کہ وہی حقیقت میں ایک شوریدہ مزاج کے دل کی آرائش و زینت کا سامان ہے، جو آسانی سے ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتا، اس کے لئے حوصلہ اور غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہے۔

نہ کھینچ اے چارہ گر مجروح دل سے تیر کے ٹکڑے سجایا ہے بڑی کاوش سے ہم نے اس گلستاں کو

جناب دل کے اِس ذوقِ گلستاں آرائی کی داد دینا آسان نہیں، اس کی لطافت کو صرف صاحب ذوق ہی محسوس کر سکتا ہے۔

وارفتگی کے عالم میں احترامِ حسن کا احساس دل میں موجود ہے، چنانچہ آستانِ یار کے قریب پہونچ کر دفعتہً سنبھل جاتے ہیں کہ یہ ادب کا مقام ہے۔

ذروں میں کچھ کشش ہیں محسوس ہو چلی اے دل سنبھل کہ حشیں نظر کوئے یار ہے

ایک ایک لفظ پر غور کرو کسقدر روحانی کیف میں ڈوبا ہوا ہے۔

جس اخلاق و عقیدت کے ساتھ آستانِ یار پر حاضر ہوتے ہیں اس کی تصویر یہ ہے:۔

یوں لے چلا ہے دل ہمیں اس جلوہ گاہ میں لختِ جگر ہیں زینتِ دامانِ آرزو

اس سے زیادہ قیمتی اور کیا نذر ہو سکتی ہے؟

محبوب کے نقشِ پا میں بھی ان کی عقیدت پرست نگاہوں کو کیف و نشاط کے جلوے نظر آتے ہیں

ذراتِ دل نشاط سے معمور ہو گئے
فردوسِ آرزو ہے کہ آغوشِ نقشِ پا

اپنی ہستی کو رضائے دوست پر وقف کر دینے کو منزلِ مقصود کی دلیل سمجھتے ہیں۔

سمجھا ہوں اس کو منزلِ مقصود کی دلیل
دل ہے کسی کے نقشِ قدم پر مٹا ہوا

در یار پر گرنا ان کے نزدیک عشق کی معراج ہے۔

در دلبر پہ گرا میں تو مقدر نے کہا
بیخودِ عشق یہ معراج ہے اُفتاد نہیں

لیکن اہلِ ہوس کی طرح ذلیل ہو کر نہیں گرتے بلکہ جوش مسرت اور فخر و ناز کے ساتھ، جس کی تصویر یہ ہے:-

گرے یوں ان کے سنگِ آستاں پر
جبینِ عجز پہونچی آسماں پر

پاسِ ادب کا یہ عالم ہے کہ شکوہ طرازیاں تو درکنار اظہار مدعا کی بھی جرات نہیں۔

حضور یار شکوہ دل کا تو کیا ذکر
گراں ہے مدعائے دل زباں پر

اور اگر کبھی اس کی نوبت بھی آتی تو زبان سے نہیں بلکہ اشکوں کی خاموش روانی سے اپنی روداد وفا بیاں کرتے ہیں

اشکوں کی روانی ہے رودادِ وفا گویا
خاموش یہ شکوے ہیں اک شاہدِ رعنا سے

یہ ہے ذوقِ محبت کی وہ متانت اور سنجیدگی جو صرف اہلِ نظر کا خاص حصہ ہے،

ان مثالوں سے تم کو کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جناب دل کے کلام میں نیاز و عقیدت اور اخلاص و وفا کی گرمی کس حد تک موجود ہے اور وہ کہاں تک بارگاہِ حُسن کے ادب شناس ہیں، عام شعرا جن کی طبیعتیں نکتہ شناس نہیں ہوتیں، عقیدت کے جوش میں اکثر ابتذال اور ذلت و خواری کی حد تک پہونچ جاتے ہیں اور طرح طرح کی عامیانہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگتے ہیں جو عشق و محبت کی شانِ بلندی کے خلاف ہوتی ہیں مثلاً کسی کا شعر ہے

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

لیکن ہم اس حد تک جوشِ عقیدت کے قائل نہیں، غیرت و خودداری عشق کی شرط اولیں ہے، عقیدت کے یہ معنی نہیں کہ عاشق اپنے کو بالکل پست اور ذلیل کر دے، بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ حسن کی مرتبہ شناسی کے ساتھ ساتھ عشق کی عظمت کا احساس بھی قائم رکھے لیکن یہ ایسا نازک مرحلہ ہے جس سے صرف محرمانِ خاص ہی کامیابی کے ساتھ گزر سکتے ہیں، جناب دل کی حقیقت شناسی اور بلند نظری ناقابلِ انکار

ہو جاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انتہائی جوشِ نیاز و عقیدت کے عالم میں بھی عشق کی عظمت کا احساس ان کے دل میں موجود ہے، ان کے دل کا ذرہ ذرہ جوشِ نیاز سے لبریز ہے، محبوب کی ایک ایک ادا پر مٹ جانے کے لئے ہمہ تن تیار ہیں عجز و اُفتادگی ان کی معراجِ آرزو ہے، تیرِ ستم کے ٹکڑوں سے اپنے قلب و جگر کی آرایش کرتے ہیں، دوست کا ہر ظلم ان کے لئے پیامِ رحمت ہے، راہِ طلب کی ہر ٹھوکر پر ان کے منھ سے بجائے اُف کے آفریں نکلتی ہے، نقشِ پا ان کو فردوسِ آرزو نظر آتا ہے، کوئے یار میں ہر ہر قدم پر آنکھیں بچھاتے چلتے ہیں، یہ سب کچھ ہے، تاہم ان کا آئینۂ عقیدت ابتذال و ذلت کی گرد سے پاک ہے، بے شبہ وہ بارگاہِ حسن کے خادم ہیں لیکن ایسے خادم ہیں، جس کو اپنے حسنِ خدمت پر ناز ہے، جس کی جبینِ عقیدت کے سجدے ذلت و خواری کے سجدے نہیں ہیں، بلکہ وہ سجدہ ہائے شوق و نیاز ہیں، جن پر آستانِ یار کو بھی فخر و وجد ہے۔

کئے ہیں سجدے یہ کس نے کہ فرطِ نخوت سے دماغ عرش پہ ہے تیرے آستانے کا

حُسن کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عشق صرف اس کا ایک پرتو ہے، بلکہ اس کے اندر کچھ مستقل کیفیتیں بھی ہیں اس احساس کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

سراپا شوق ہوں نقشِ وفا ہوں شکلِ حیرت ہوں مجھے بھی دیکھ او حسنِ خود آرا دیکھنے والے

یعنی صرف تو ہی نہیں ہے بلکہ میں بھی ایک قابلِ اعتنا چیز ہوں، گو ایک ذرہ حقیر ہی سہی۔

نگاہِ شوق میں وہ صلاحیت و استعداد ہے کہ جب جوشِ کیف میں اُٹھتی ہے تو حریمِ حسن کے پردہ ہائے در اُلٹ جاتے ہیں،

جلوۂ رعنا کی فطرت ہے اسی حد تک حجاب جب نگاہِ شوق اُٹھی پردہ ہائے در اُٹھے

کاش یہ ذوقِ نگاہ کی قابلیت ان لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتی جو حریمِ یار میں رسائی کے لئے درباں کی نگاہِ کرم کے محتاج رہتے ہیں۔

نگاہِ شوق بے شبہ اسی لئے ہے کہ جمالِ یار پر قربان ہو جائے، لیکن جناب دلؔ اس کو اس شان کے ساتھ نثار کرتے ہیں کہ خود حسن کی رونق و زینت دوبالا ہو جاتی ہے

قربان ہو کے آج کسی کی نگاہِ شوق زینت فزائے حُسنِ خداداد ہو گئی

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ جناب دلؔ نے باوجود جوشِ عقیدت کے عشق کی شانِ عظمت کو بھی قائم رکھا ہے اور یہ ان کے حُسنِ مذاق کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

حیات و ماورا حیات

اس دور کے علما طبعیات میں، سر آلیور لاج بڑے مرتبہ کا شخص سمجھا جاتا ہے اور اس نے حیات بعد الموت کے متعلق جو عملی تحقیقات کی ہے، وہ خواہ کتنی ہی ناقص و ناکمل کیوں نہ ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ "خیال و قیاس" کا اتنا ضخیم دفتر اپنے بعد چھوڑ گیا ہے کہ اس کو ٹھکرا کر آگے گزر جانا آسان نہیں۔ وہ نہ صرف اس بات کا قایل تھا کہ مرنے کے بعد روح قایم رہتی ہے، بلکہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ روح کا تعلق دُنیا اور اہلِ دنیا سے باقی رہتا ہے اور وہ اپنے تاثرات سے بھی مطلع کرتی رہتی ہے، چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کی روح سے گفتگو کی۔

بہر حال اس نے کسی روح سے واقعی گفتگو کی ہو، یا یہ خود اس کا استہواء ذاتی[1] (Auto Suggestion) ہو اس کے نظریوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں، ظاہر ہے کہ وہ اپنے اعتقاد و یقین کی کوئی ایسی علمی توجیہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کی گنجایش نہ چھوڑے، اور اُس نے جو کچھ کہا ہے اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے کہا ہے جس کا دوسرا نام (Common sense) ہے۔ اس لئے بحث و تنقید کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کے ذوق کا مطالعہ اپنے ذوق کے لحاظ سے کیا جائے۔

وہ بھی دوسرے مفکرین کی طرح روح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرنا

[1] عمل مقناطیسی یا مسمریزم میں ایک عمل کا نام (Suggestion) ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو قوت ارادی سے اس حد تک متاثر کیا جائے کہ وہ عامل ہی کی خواہش کا پابند ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی ترجمہ عربی میں عام طور پر استہواء کیا جاتا ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے پوری طرح اس لفظ کے مفہوم پر حاوی ہے۔ (Auto suggestion) سے مراد خود اپنے ہی خیال سے متاثر ہو جانا ہے اس لئے اس کا ترجمہ استہواء ذاتی کیا گیا۔ (اڈیٹر)

چاہتا ہے اور جس وقت وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ نوع انسانی نظام کائنات میں ایسے مختصر سیارہ کی رہنے والی ہے جس کو دوسرے اجرام سماوی کے مقابلہ میں کسی قسم کی کوئی اہمیت حاصل نہیں، تو دفعتاً اس کا خیال کائنات کی عظمت کے ساتھ ہی ساتھ انسانی عظمت کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور اس کا دل قبول کرنا نہیں چاہتا کہ جس قوت نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ اسے یوں دفعتہً فنا کر دے۔

اس رنگ کے سوچنے والوں کی رفتار خیال یہ ہوتی ہے :-

۱- انسان باوجود اس قدر ترقی کر جانے کے بھی ہنوز انتہائی مدارج ارتقا تک نہیں پہونچا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ یقیناً اس کو منزل حقیقی تک پہونچنا ہے، کیونکہ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو پھر غایت آفرینش کوئی نہ رہیگی اور یہ سب کچھ فعل عبث قرار پائے گا۔

۲- اگر انسان کی دُنیاوی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ ستر، اسی سال سے زیادہ نہیں ہیں جو او قیانوسِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے ایک قطرہ کے لاکھویں حصہ سے بھی کم ہے، پھر کیا انسان کو یہ عقل و فراست صرف اس لئے دیگئی ہے کہ وہ چند سال تک زندہ رہکر فنا ہو جائے اور مرنے کے بعد اس کا کوئی مستقبل متعین نہ ہو۔

۳- زندگی آتی ہے، کہاں سے؟ کسی کو معلوم نہیں، چلی جاتی ہے، کہاں؟ اس کی بھی خبر نہیں۔ پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کسی شخص کا وجود عبادت ہے صرف اس مختصر مدت سے جو اس آنے جانے کے درمیان بسر ہوتی ہے۔ یقیناً نہیں، بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی حیات کوئی ایسا سلسلہ ہے جو دو چیزوں کو ملاتا ہے جن میں سے ایک ازل اور دوسری ابد ہے۔

۴- عالم طبیعی کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی، صرف اس کی صورتیں یا حالتیں بدلتی رہتی ہیں جن کو ہم اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے وجود کی حیثیت بدل جاتی ہے جنھیں حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور حس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح سے مخاطبت ممکن ہے تو پھر یہ مسئلہ ظن و تخمین کا نہیں رہتا بلکہ واقعہ و حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۵- ہم ایتھر کے قایل ہیں، مادہ و قوت کے باہمی تفاعل کو مانتے ہیں، درانحالیکہ ہم کو نہ ایتھر نظر آتا ہے اور نہ کیفیت تفاعل محسوس ہوتی ہے۔

آج حرارت و نور، برق و کہربا، حرکت و مرونت وغیرہ تمام طبیعی کیفیات حقایق مسلمہ میں داخل ہیں، لیکن کیا

کوئی شخص اُن کی حقیقت کی علمی توجیہہ و تعلیل کرسکتا ہے؟

بعض علماء حیات کا دعویٰ ہے کہ عقل و زندگی دونوں مادہ کے وظایف میں سے ہیں، پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ مرنے کے بعد، جسم سے علٰحدہ ہونے کے بعد اس زندگی کی نوعیت بدل جائے جو اس وقت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

الغرض وہ لوگ جو معاد کے قایل ہیں اُن کی طرف سے اسی قسم کے دلایل پیش کئے جاتے ہیں، جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سب کا عنصر مشترک اعتراف "جہل ولاعلمی" کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ ان کے دلائل کی بنیاد صرف اس خیال پر قائم ہے کہ جس طرح ہمیں کچھ علم نہیں کہ اس وقت یہ سب کچھ کیونکر ہو رہا ہے، اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیندہ جو کچھ ہوگا کیونکر ہوگا یعنی اگر انسان اس دنیا میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جسم فنا ہونے کے بعد بھی اس کی زندگی کسی اور صورت سے قایم رہے۔

وہ سر آلیور لاج ہوں، یا کینن ڈایل یا کوئی اور شخص، علمی دُنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیل معاد کے ثبوت میں پیش ہی نہیں کی جاسکتی اور چونکہ اس نوع کے دلایل جن میں صرف امکان سے بحث ہوتی ہے مخاطب کے لئے باعث تسکین نہیں ہوا کرتے، اس لئے اُنھوں نے عملی طور پر بھی وجود روح کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس حد تک دعویٰ کر بیٹھے کہ وہ روحوں سے گفتگو کرتے ہیں، روحیں اُن سے گفتگو کرتی ہیں اور حیات بعد الموت کا بھی تقریباً وہی نظام ہے جو اس دنیا کے عالم حیات کا ہے۔ یعنی جسم سے جدا ہونے کے بعد روحیں محبت کرتی ہیں، نفرت کرتی ہیں، کھاتی ہیں، پیتی ہیں، چلتی پھرتی ہیں اور جو تصویریں ارواح کی شایع ہوئی ہیں اُن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریشمی کپڑے بھی پسند کرتی ہیں، ٹیڑھی مانگ بھی نکالتی ہیں اور اونچی ایڑی کا جوتا بھی پہنتی ہیں۔

اس لئے جب معاملہ عقلی نظریوں سے گزر کر اس حد تک حواس ظاہری کے ماتحت آجائے تو پھر سوائے تسلیم کر لینے کے کیا چارہ ہے، مگر سوال یہی ہو کہ کیا روحوں سے گفتگو کرنے اور اُن کے ظاہر ہونے کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ واقعی صحیح ہیں؟ کیا حقیقتاً جو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں یا جو آوازیں کان میں آتی ہیں وہ روحوں ہی کی ہیں؟

اس باب میں کافی تحقیق ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سو میں اسّی دعوے کرنے والے تو بالکل جھوٹے ہیں، باقی ۲۰ میں دس ایسے ہیں جو قوت مقناطیسی سے کام لیکر دوسروں کو فریب نظر میں مبتلا کر دیتے ہیں اور دس وہ ہیں جو اپنے اعتقاد و یقین سے مسحور ہو گئے ہیں۔

پھر اگر آئیورلاج وغیرہ کی انتہائی رعایت کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کا شمار اسی آخرالذکر جماعت میں کیا جائے اور ان کو "سوذازدہ" سمجھ کر معاف کر دیا جائے۔

اگر روحوں کو جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی انھیں تمام منازل حیات سے گزرنا ہے جو تعلق جسم کی حالت میں ان کو پیش آئے تھے، تو پھر اس تغیر و تبدل کے معنی کیا ہوئے۔ اس دُنیا میں اس جسم کے ساتھ انھیں کیوں نہ باقی رہنے دیا گیا اور قدرت نے کیوں فضول اتنی زحمت گوارا کی۔

البتہ عقلی توجیہہ کے سلسلہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ جب مادی دُنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ روح کو فانی کہا جائے۔ مگر گفتگو سب سے پہلے اس باب میں ہونی چاہئے کہ جس کا نام ہم نے رُوح رکھا ہے وہ بجائے خود کوئی جوہر ہے یا صرف عرض ہے، یعنی اس کا کوئی وجود علیحدہ پایا جاتا ہے یا اک کیفیت کا نام ہے جو عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے مثلاً یوں سمجھئے کہ ہم جس وقت پانی میں شکر حل کر دیتے ہیں تو پانی میں ایک کیفیت حلاوت و شیرینی کی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن شیرینی کوئی علیحدہ مستقل چیز تو نہیں، اگر ہم پانی سے شکر کو پھر علیحدہ کر دیں تو یہ کیفیت جاتی رہیگی۔ پھر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس حالت میں شیرینی کہاں چلی گئی تو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پانی اور شکر کے جدا جدا کر دئے جانے سے فنا ہو گئی۔

بالکل یہی صورت روح کی ہے کہ بعض مادی اجزاء کے باہمی تفاعُل یا عناصر کے امتزاج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا نام زندگانی یا روح ہے اور جب وہ امتزاج باقی نہیں رہتا تو وہ کیفیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے اور ایسی معمولی بات کے سمجھنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر انسان کی آفرینش کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ چند دن کی عارضی زندگی بسر کر کے فنا ہو جائے تو اس کے پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی، سو یہ سوال بجائے خود اتنا لغو و مہمل ہے کہ ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد اس کی لغویت کو سمجھ سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کی بنانے والی کوئی ایسی قادر مطلق ہستی ہے جسے خدا کہتے ہیں تو اس کی حقیقت و عظمت کو سامنے رکھکر یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا کہ اس کے نزدیک ایک کیڑا جو فراست و تعقل سے بالکل بے بہرہ ہے اور ایک انسان جو فہم و عقل کا پتلہ ہے دونوں برابر ہیں اور اگر روح کے فانی تسلیم کرنے کی حالت میں خدا پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا تو ایک کیڑے کی طرف سے بھی یہ احتجاج ہو سکتا ہے کہ عقل و فہم سے بیگانہ رکھنا تھا تو کیوں وجود سے عدم میں لایا۔ اس قسم کے دلایل حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتے کیونکہ

ان کا تعلق اُن معتقدات و مزعومات سے ہے جو صرف "امکان" کی بنیاد پر قایم ہیں اور حقایق کی جستجو کرنے والوں کے نزدیک محض "ممکن ہونا" کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ امکان میں جتنی گنجایش اثبات کی ہے، اتنی ہی "نفی" کی بھی ہے۔

اب رہ گیا بحث کا یہ پہلو کہ جب مادی دُنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی تو روح کو کیوں فانی مانا جائے، اس میں بھی سخت مغالطہ منطقی پایا جاتا ہے، کیونکہ جب روح بجائے خود کوئی مستقل مادی چیز نہیں ہے تو پھر اس کا دوسری مادی اشیاء کے ساتھ کیوں ذکر کیا جائے وہ صرف اک کیفیت کا نام ہے اور کیفیات کا فنا ہوجانا ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے۔

انسان میں مادی چیز اس کا جسم ہے سو اسکے اجزاء بیشک فنا ہونے والے نہیں، وہ ضرور کسی نہ کسی حالت و کیفیت میں پائے جائیں گے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس جسم میں ایک کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جسے زندگانی یا روح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ کیفیت باقی نہیں رہتی (خواہ اس کا کچھ سبب ہو) تو اجزاء میں انحلال ہو کر وہ دوسری صورت قبول کر لیتے ہیں۔

جب جسم زیر زمین دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے اجزاء کیڑوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں، یعنی اس کا جسم فنا تو نہیں ہوتا لیکن وہ صورت دوسری اختیار کر لیتا ہے۔ پھر ان کیڑوں کو دوسرے بڑے کیڑے کھا لیتے ہیں، ان کیڑوں کو چڑیاں ہضم کر جاتی ہیں، چڑیوں کو دوسرے جانور کھا جاتے ہیں اور اسی طرح ازل سے یہ سلسلہ انحلال و تفاعل کا جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی چیز ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتی کہ روح کا وجود علیحدہ پایا جاتا ہے اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے لئے بھی حیز زمان و مکاں کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی دوسری مادی اشیاء کیلئے اگر یہ کہا جائے کہ اس کی بقاء کے لئے مکان و زماں کی ضرورت نہیں تو پھر وجود کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور یہ لفظ مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

بقاء روح و معاد کا خیال مذہب کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ روح باقی رہتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ روح پھر جسم انسانی میں داخل کی جائے گی اور قیامت کے دن وہ سب اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

آئیے ذرا ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

کرۂ زمین پر انسانی آبادی کا وجود ۵ لاکھ سال سے پایا جاتا ہے لیکن اگر اس میں مبالغہ سمجھا جائے تو آیئے ڈھائی لاکھ سال فرض کر لیں۔

اس وقت آبادی ......۱،۷ انفوس پر مشتمل ہے اور اموات کی تعداد سالانہ ۴۳۳۶۹۸۱۳ ہوتی ہے۔

اگر گزشتہ ڈھائی لاکھ سال کے اموات کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت عالم برزخ میں کم از کم ۸۴۲۵۵۳۲۵۰۰۰۰۰ ارواحیں جگہ گھیر رہی ہیں اور اگر روح کے لئے کم از کم ⅛ انچہ کے برابر جگہ درکار ہو تو اسوقت تک روحوں نے اتنی جگہ گھیر رکھی ہے کہ اگر ان کو برابر برابر رکھکر فیتہ طیار کیا جائے تو ۲۱۳۹۰۷۹ میل ہوگی اور ۹۰ مرتبہ چاند اور زمین کے درمیان اسے لپیٹ سکیں گے اور اگر ان روحوں کو جمع کر کے کوئی ستون یا مینار بنایا جائے تو ½۱۹ میل لمبا مینار بنے گا جسکے چاروں ضلع میں سے ہر ضلع ½۶ میل کا ہوگا

یہ حساب تو اسوقت تک کی روحوں کا ہوا، آیندہ معلوم نہیں کب تک کرۂ ارض قائم رہیگا اور یہ ہجوم ارواح کس حد تک پہونچے گا۔

کہا جاتا ہے کہ بچھڑی ہوئی روحیں وہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ لیکن کیا یہ کہنا بالکل ایسا نہیں ہے جیسے آپ کسی ریگستان کے تمام ذروں کو ہوا میں منتشر کر کے کسی ایک ذرہ سے یہ کہیں کہ جاؤ اور اس ذرہ کے ساتھ مل جاؤ جس کے پاس سے تم کو اٹھایا گیا تھا۔

اب اسی کے ساتھ اس اعتقاد کو بھی شامل کیجئے کہ حشر بالاجساد ہوگا یعنی اس دنیا میں جس جسم کے ساتھ روح متصل تھی وہ جسم پھر پیدا کیا جائے گا تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے لئے کتنی وسیع فضا کی ضرورت ہوگی اور کتنی کرور زمینوں کے برابر چٹیل میدان اس کے لئے درکار ہوگا۔

حیرت ہے کہ بقاء روح کو مان کر اس قسم کے مضحک خیالات خدا سے وابستہ کرنے میں تو تامل نہیں ہوتا لیکن سیدھی سی یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ، جو خدا ایک بار عدم سے وجود میں لایا ہے وہ پھر وجود سے عدم تک پہونچا سکتا ہے۔

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو (مثلاً آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال، امیر، انیس، تنود، جگر، حزیں، خواجۂ کرمانی، دبیر، ریاض، سودا، شرر، صائب، صفی، عالی شیرازی، عزیز لکھنوی، غالب، حیرت، ناسخ وغیرہ) کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں۔ فن شعر و انتقاد کے شائقین کے لئے عجب چیز ہے۔　　قیمت معہ محصول ۸ عہ

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آپ پوچھتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں ؟ معلوم نہیں میری زندگی کے کس پہلو کو سامنے رکھ کر آپ نے یہ سوال کیا ہے ۔

اگر مقصود میری لٹریری زندگی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ

ساختہ ام خامہ زبانِ پری

اگر مدعا میرے جمالیاتی ذوق کو معلوم کرنا ہے تو یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ

غازہ نہم بر رخ خورشید و ماہ

اور اگر مراد یہ ہے کہ میرے تاثرات کا صحیح علم آپ کو حاصل ہو تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ

آتشِ بے دود فسردہ زندہ ام

کُنہِ حقیقت کے ذکر سے قصداً احتراز کرتا ہوں کیونکہ آج نہیں تو کل ساری دنیا کے ساتھ آپ خود میرے

"نیاز آخر الزماں"

ہونے پر ایمان لے آئیں گے ۔ نیاز

خدا جانے وہ کون تھا جس نے یہ رسم ڈالی کہ کسی کو خط لکھو تو ابتدا " القاب و آداب " سے کرو، تمھیں بتاؤں کہ تم کو کیا لکھوں، مجھ سے بڑے ہوتے تو قبلہ و کعبہ لکھدیتا، چھوٹے ہوتے تو عزیز باتمیز لکھدیتا، گو تکلف سے ۔ برابر کے دوست ہو اور اُس وقت کے جب ہماری اور تمھاری روحوں کے علاوہ اور سب نے " قالوا بلیٰ " کہا تھا پھر اگر میں نے کبھی اپنے آپ کو مخاطب کرنے کے لئے کوئی لفظ استعمال کیا ہو تو تمھارے لئے بھی استعمال کردوں خیر ہماری یہ تمہید اس لئے ہے کہ آیندہ سے نہ تم میرے "مکرم و محترم" ہو اور نہ میں تمھارا "مطاع و معظم"، نہ تم کچھ نہ میں کچھ ۔

اچھا اب خط شروع ہوتا ہے اور براہ راست ڈانٹ سے یعنی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کو کس احمق نے مشورہ دیا کہ نگار اُن کو دکھاؤ اور اپنے ساتھ مجھے بھی گالیاں سنواؤ۔ غالب عرصہ ہوا محاکمہ کر چکا ہے کہ

مے بزہادمکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ازیں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

مگر تم کو ہنوز اس قوم پر اعتبار باقی ہے۔

بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا، لیکن اب مجھے ذرا تفصیل سے لکھو کہ نگار کے مطالعہ کے بعد انکی پیشانی پر کتنی شکنیں پیدا ہوئیں، کس قسم کی گالیاں صرف فرمائیں اور کف آلود ہونٹوں نے ریش مبارک کو کتنا تر کیا۔

اللہ، اللہ، یہ بھی کیا لوگ ہیں۔ صرف احمق ہوتے تو خیر "اہل جنت" میں شمار ہو جاتا، لیکن خبث باطن کا کیا علاج جو یہاں بھی انھیں "آتش زیر پا" رکھتا ہے اور وہاں بھی "آتش در شکم" بنائے بغیر نہ رہیگا اگر واقعی دوزخ کوئی چیز ہے اور "اکل حرام" قابل تعزیر۔ میری طرف سے مولانا کی مزاج پرسی کردو اور پوچھ لو کہ اگر در توبہ ابھی بند نہ ہوا ہو تو حاضر ہوں۔

نیاز

بندہ نواز۔۔ مکرمت نامہ کا شکریہ ادا کروں تو کس زبان سے، نہ ادا کروں تو کس دل سے؟ ہر چند آپ کو نہ اسکی ضرورت نہ اِس کی پرواہ، لیکن میں اتنا بھی مجبور نہیں کہ مجبوری کا اظہار نہ کر سکوں۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ سزائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شایستۂ پائے تو بود

دُنیا میں لطف و کرم نئی چیز نہیں رافت و محبت کو گوگردِ احمر نہیں، اُلفت و ہمدردی بہ عنقا نہیں۔ لیکن ایک چیز اور ہے جسے "ادا" کہتے ہیں، پھر بتائیے کہ ایسے لوگ جو احسان کر کے خود زیر بار احسان ہو جائیں کہاں ہیں؟

یہ تو خیر ازراہِ رسم کہیئے یا بر بنائے "جذبۂ شوق" لکھنے کو لکھ گیا، مگر اب یہ بتائیے کہ میں کیا کروں؟

آپ میری فطرت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ

بر سرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست

اور اسی کے ساتھ "پرکاہ" پر "کوہ شکنی" سے بھی باز نہیں آتے، یہ کیا تماشہ ہے۔ اگر سوال رد و قبول کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن جب زہر پی لینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو کیا مجھے یہ پوچھنے کا بھی حق حاصل نہیں کہ

درکشتنِ من اینہمہ بیباک چرائی

ڈر رہا ہوں کہ اس کے جواب میں آپ کوئی اور تیر نہ صرف کردیں۔

نیر بار کرم

نیاز

اے صاحب مکارم اخلاق کردگار؛

یہ غالباً چوتھا عریضہ ہے جو خدمت گرامی میں پیش کر رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو پچھلے خطوں کا ہوا۔

ہرچہ از گریہ فشاندیم بہ نشم دن ریخت
ہرچہ از نالہ رساندیم نہ نشنودن رفت

لیکن تسکین ہے تو صرف اس خیال سے کہ یہ عریضہ جواب کی توقع سے نہیں بلکہ اعلان "قطعِ امید" کے طور پر لکھ رہا ہوں اور آپ کی اس طویل خاموشی یا مسلسل بے اعتنائی کا جواب میری جانب سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا۔

عمرت دراز باد فراموشکار من ؟

نیاز

بسوز غالب آزردہ را و باک مدار
بشرط آنکہ تواں گفت نامسلمانش

جتنا چاہو ظلم کرو، جس قدر جی میں آئے ستاؤ، لیکن خدا کے لئے یہ تو نہ کہو کہ میں اس کا سزاوار تھا۔ یقیناً تم معشوق ہو، محبوب ہو، لیکن کیا یہ کاروبار بغیر "دشنہ و خنجر" کے چلتا ہی نہیں ؟

نظرِ بد دور، میں تمھیں ٹوکتا نہیں، کیونکہ شہر میں تمھیں ایک قاتل رہ گئے ہو، بلکہ یونہی بر سبیل تذکرہ، سرسری طور پر، روا روی میں، پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی تمھاری نیت خراب ہے

ایک لطیفہ سنو — ایک بار شہنشاہ اکبر محل کے زینہ پر چڑھ رہا تھا اور بیربل بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اکبر نے جو اسوقت کسی قدر مغموم تھا پلٹ کر بیربل سے کہا کہ اگر اوپر کوٹھے تک پہونچتے پہونچتے تم مجھے نہ ہنسا سکے، تو قتل کر ڈالوں گا۔ بیربل نے اپنے لطائف و ظرائف شروع کئے اور اکبر آہستہ آہستہ زینے طے کرنے لگا، لیکن کسی بات پر اس کو ہنسی نہ آئی، آخر جب

حرف ایک زینہ رہگیا اور اکبر کو کسی طرح ہنسی نہ آئی تو بیربل نے گھبرا کر نہایت بھیانک آواز میں اکبر سے مخاطب ہو کر کہا کہ " او ہمایوں کے بچے کیا سچ مچ تو مجھے آج ہی مار ڈالے گا"، اکبر یہ سنکر ہنس پڑا اور بیربل کی جان بچ گئی —

تو اس طرح میں بھی تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی تم مجھے ہلاک ہی کر ڈالو گے اور میری ایک نہ سنو گے — اسکے جواب میں اکبر کی طرح تم نہ ہنس پڑنا کیونکہ اس کی ہنسی سے تو خیر بیربل کی جان بچگئی تھی، لیکن یہاں تو خاتمہ ہی ہو جائیگا۔ ہاں ہاں، کہو کہ میں تم کو بتاتا ہوں۔ مگر میں کبھی نہ کہوں گا کہ تم نے ظلم کر کے میرا کیا بگاڑ لیا — یاد رکھو ایک ایک منٹ کی خبر مجھے پہونچتی ہے، تمھاری محفل میں میرا گزر نہیں، تمھاری تنہائیوں میں میرا کوئی حصہ نہیں، لیکن تمھاری جلوت و خلوت دونوں کا حال مجھ پر آئینہ کی طرح روشن ہے — رقیبوں ہی میں سے ایک کو رازدار بنا رکھا ہے — تم بغیر پوچھے "ایمن" کا نام لے دوگے، اچھا ہے، جتنی سزا بھی اس کو ملے کم ہے۔ کمبخت یہاں سے گیا تو ملا تک نہیں۔

نیاز

یہ جو تمام دنیا میں ۴۰ سال تک خستہ و خوار پھرنے کے بعد آپ کو گھر بسانے کا سودا ہوا ہے، سو کیوں؟ اگر "شایانِ دست و بازوِ قاتل" نہیں رہے تو پھر قاتل کی جستجو کیوں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر اسوقت تک جو کرتے رہے ہو وہی اب بھی کرو۔ دم کیوں توڑے دیتے ہو۔ ہات پاؤں کیوں ڈھیلے ہوئے جا رہے ہیں؟

آپ نے جو شرائط شادی پیش کئے ہیں وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ یعنی آپ کو ایک ایسی عورت چاہئے جو حُسن میں کوہِ قاف کی پری ہو اور دولت میں راکفلر یا فورڈ کی بیٹی — خیال اچھا ہے، کیونکہ تم بھی تو اپنی بدصورتی اور افلاس میں جواب نہیں رکھتے، ہوش میں آؤ، کیوں دماغ خراب ہوا ہے۔ اول تو ایسی عورت ملنا محال ہے اور اگر مل بھی گئی تو وہ مجھے چھوڑ کر تمھارے پاس کیوں جانے لگی — یاد رکھو بدصورت مرد کے لئے حسین بیوی سے زیادہ دنیا میں کوئی عذاب نہیں، اگر اس کو تم سے محبت نہ ہوئی (اور محبت ہونے کی کوئی وجہ نہیں) تو اس عذاب میں مبتلا رہو گے کہ خدا جانے کب تمھیں چھوڑ بیٹھے اور اگر محبت ہو گئی تو ہمیشہ اس کے غلام بنے رہو گے، کیونکہ یہی ایک صورت تمھارے لئے اعترافِ محبت کی ہو سکتی ہے —

اگر آزادی ایسی ہی ناگوار ہے، تو کوئی عورت معمولی شکل و صورت کی ڈھونڈھو، جو تمھاری قدر کرے، اور تمھارے آئینہ میں اپنا بھی منھ دیکھ سکے۔ جھونپڑے میں رہنا اور محلوں کا خواب دیکھنا سراسر حماقت ہے —

نیاز

مطاعی الاجل -

آپ نے اچھا کیا کہ عزیز سلمہ کو سب سے پہلے فارسی شروع کرادی - نصاب کے متعلق کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ اصولاً میرے نزدیک پہلے کلاسکل فارسی پر عبور ہوجانا ضروری ہے، جدید فارسی علوم و فنون کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی توقعات اپنے اندر رکھتی ہو، لیکن نہ جمالیاتی ذوق اس سے تحریک میں آتا ہے نہ فنی تکمیل ہوتی ہے- رہی نزاکت خیال سو اس کا اس زمانہ میں ذکر ہی کیا - ایران اسوقت خالص سیاسی راہوں سے گزر رہا ہے اور اس کو سوائے اقتصادیات پر توجہ کرنیکے اور کوئی کام فی الحال نہیں کرنا، اس لئے ہندوستان میں بیٹھکر صرف ایران جدید کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا اور فارسی انشار کی تکمیل کی توقع رکھنا بیکار ہے-

آب انشار بہار عجم کے بعد گلستاں شروع کرادیجئے (گو یہ کتاب پختہ عمر میں دیکھے جانے کے قابل ہے) اسکے بعد پنج رقعہ، شبنم شاداب، رسایل طغرا، سہ نثر ظہوری اور ابوالفضل، نظم میں سکندر نامہ کے ساتھ جستہ جستہ شاہنامہ پڑھانا بھی ضروری ہے - غالب کی مثنویاں، عرفی و خاقانی کے قصائد بھی نگاہ سے گزرنا چاہیے - بار چاچ کو لوگ نظر انداز کردیتے ہیں، حالانکہ وہ بھی اپنی جگہ ایک چیز ہے - دواوین میں سعدی، فیضی، خسرو، حافظ و نظیری کا مطالعہ ہونا چاہئے - صنائع و بدائع میں اعجاز خسروی خاص چیز ہے لیکن اس کے پڑھانے والے ایران میں بھی نہیں ہندوستان کا کیا ذکر - اخیر عہد میں صرف ایک صہبائی تھے، جن سے اعجاز خسروی پڑھنے کے لئے ایران کا ایک شہزادہ ہندوستان آیا تھا - میرے والد نے بھی اس کتاب کو صہبائی سے پڑھا تھا اور میں نے اپنے والد سے، پھر جب یہ تمام مواقف طے ہوجائیں اور نزاکت تخییل سے لطف اُٹھانے کی پوری اہلیت پیدا ہوجائے تو بیدل کا مطالعہ کرنا چاہئے، جو اپنے سوا تمام لٹریچر سے انسان کو بے نیاز بنا دیتا ہے-

فارسی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ عربی ضروری ہے کیونکہ کلاسکل فارسی میں اس کا عنصر غالب ہے، لیکن عربی کے معنے نیتہ المصلی، شرح وقایہ، ہدایہ، اور مشکوۃ نہیں ہے، بلکہ قواعد و لغت، ادب و انشار کی تکمیل ہے - جب اسمیں کچھ درک پیدا ہوجائے تو علوم مغرب کی طرف متوجہ کیجئے کہ بغیر ان کے حاصل کئے ایک آدمی مولوی، راہب، صوفی، زاہد، عاشق، گداگر سبھی کچھ بن سکتا ہے، لیکن انسان نہیں بنتا اور نہ اس کی ذہنی غلامی دور ہوتی ہے - قرآن کا مطالعہ عربی کے ساتھ ساتھ ہونا چاہئے، ابتدا میں بچوں کو کلام مجید پڑھانا سخت اصولی غلطی ہے کیونکہ اس کے مطالب نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے بچہ کا دماغ مشوش ہوجاتا ہے اور نہایت ہی مہلک قسم کی مقلدانہ ذہنیت پیدا ہونے لگتی ہے حتٰے کہ کلام مجید کا مفہوم صرف جزدان و رحل رہجاتا ہے یا پھر اسکی آیتیں زعفران

سے لکھ لکھ کر لوگوں کو بلانا — مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے اور فن حدیث کی تنقیدی تحقیق بھی، لیکن یہ باتیں بعد کی ہیں جب، بچہ سے عمر متجاوز ہو جائے۔

ساتھ ہی ساتھ آپ ہندی بھی پڑھائیے اور تھوڑی سی سنسکرت بھی کیونکہ ہندوستان میں رہکر مسلمانوں کا ہندوؤں کے کتابوں اور اُن کے علوم سے بے خبر رہنا، ناقابل معافی غلطی ہے۔ اور یوں بھی جب فلسفہ و تصوف کا مطالعہ کیا جائے گا تو ہندوؤں کا لٹریچر دیکھنا ناگزیر ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ، گیتا و انجیل کو نظرانداز نہ کیجئے اور جب آپ اپنے بچہ کو نماز روزہ کا درس دیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین کیجئے کہ ہندوؤں کا ناقوس و مندر بھی قابل احترام چیزیں ہیں اور رام و کرشن بھی اپنے زمانہ کے پیغمبر تھے جو ہندوستان میں مبعوث ہوئے تھے — مدعا یہ کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا خیال بھی ضروری ہے تاکہ مذہبی تنگ نظری نہ پیدا ہو۔

اگر یہ تمام مراحل آپ کے لئے دشوار گزار ہیں تو عزیز کو میرے پاس بھیجدیجئے، لیکن یہ آپ کیوں کرنے لگے جبکہ آپ کے پیر کے نزدیک میرا ماحول بھی اس قدر سخت کفر آلودہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے حق میں جو میرے پاس اُٹھتا بیٹھتا ہے ان کی دعا بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ آپ نے دیکھا یہ ہیں بلند مرتبے میری نامسلمانی کے، آپ کیوں ایمان لانے لگے۔

نیاز

تم تو ہو بالکل وہ، یہاں تو عاشقی میں وہ زور و طنطنہ تھا کہ جب تک بنی بنی، اور جب نہیں بنی، تو تم کو معلوم ہے میں نے کیا کیا؟

دل را بزور از کفِ دلبر گرفتہ ایم

ہر چند تم ایسے لجوج، خاکسار، فدوی قسم کے عاشق سے جو معشوق کے حضور میں اس حد تک "زمیں دوز" ہو جانا پسند کرے کہ نقش قدم سے گزر جائے، اس جرأت کی توقع رکھنا لاحاصل ہے، تاہم اس خیال سے کہ ہاشمی خون تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے، غیرت دلاتا رہتا ہوں، ممکن ہے کسی وقت بھر جاؤ اور اس عذاب سے نجات حاصل کر سکو ماشاءاللہ سن وقوف کو پہونچ گئے ہو، عمر طبیعی نصف سے زائد ختم ہو چکی ہے، علائق کا بار بھی کم نہیں، فرض شناسی کے بھی مدعی ہو اور دنیا کی تمام باتوں میں طبیعت پر جبر کر سکتے ہو، لیکن اس باب میں تم طفل شیر خوار بنے ہو۔

میں تم سے زیادہ اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ شاید ہی کوئی دوسرا محبت ناشناس ایسا پیدا ہوا ہو۔

اب بھی وقت ہے کہ اس حقیقت کو جان کر، دامن بچا جاؤ، موج خون سر سے گزر جانے کے بعد اگر ہوش آیا بھی تو بیکار ہے۔
نیاز

صدیقی ۔۔ غزل پہونچی ۔ کیا کہنا، اسی کو کہتے ہیں:۔

زدل جستہ و با دل آویختہ

ہر چند میں شعر و سخن سے بیگانہ ہو گیا ہوں، لیکن جب کوئی شعر، واقعی شعر، نگاہ سے گزر جاتا ہے تو اب بھی بیتاب ہو جاتا ہوں۔ موجودہ دورِ تغزل معنی آفرینی کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو، مگر کار و بار محبت سے بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ میں اکبر مرحوم سے ملنے الہ آباد گیا۔ ان کا بالکل آخری زمانہ تھا اور عشرت منزل میں وہ اپنی تنہا سوگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں اکبر کا بہت ادب کرتا تھا، ان کے شاعرانہ کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ والد کے دوستوں میں سے تھے اور غدر کے بعد کانپور میں برسوں دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ وہ بھی مجھ پر بزرگانہ شفقت صرف فرماتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مطبوعہ دیوان مرحمت فرماتے ہوئے کہا کہ:۔ "میں نے طبا طبائی سے پوچھا کہ آپ کو سب سے بہتر شعر میرے دیوان میں کونسا نظر آیا۔ انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:۔

دُنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

اب تم بتاؤ کہ تم نے کس شعر کو پسند کیا ہے:۔
میں نے عرض کیا کہ یوں تو سیکڑوں اشعار انتخاب میں آسکتے ہیں، لیکن وہ شعر جس کو ایک بار پڑھنے کے بعد میں کبھی نہیں بھولا اور نہ بھول سکتا ہوں یہ ہے:۔

آرزو دل میں ہو اک شخص سے ملنے کی بہت
نام کیا لوں، کوئی اللہ کا بندہ ہوگا

یہ سنکر اکبر سر پکڑ کر دیر تک خاموش رہے اور پھر بولے کہ:۔ "عمر میں بالکل پہلی مرتبہ تم ایسے شخص نظر آئے ہو جس نے اس شعر کا ذکر کر کے، میرے محبوب ترین دورِ شاعری کو یاد دلا دیا"

مدعا یہ کہ میرا مشرب۔ تغزل کے باب میں ذرا قدامت پسند واقع ہوا ہے اور تصوف و فلسفہ طرازی میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسی لئے فارسی میں سعدی اب بھی میرا محبوب ہے اور اردو میں میر و درد پر جان دیتا ہوں۔

زبان کی ترقی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جذبات کو اُن کے حقیقی رنگ میں ظاہر کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہوجائے، تصنع اور چوچلے کا میں قایل نہیں۔

میر خالص زبان و محاورہ کی شاعری کرتا ہے تو بھی اس رنگ کی کہ

میر نہیں پیر تم ، کاہلی اللہ رے !
نام خدا ہو جواں ، کچھ تو کیا چاہیے

لیکن آج کل کا شاعر جب لطف زبان پیدا کرے گا تو اس سے آگے نہ بڑھے گا کہ

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا، آپ کو زحمت ہو گی

میں نے جو آپ کے کلام کو پسند کیا تو اسی لئے کہ اس میں تصنع و آورد نہیں ہے، بیجا اینچ پینچ نہیں ہے، واردات قلب ہیں جن کو آپ نے سادہ الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے۔

خدا کے لئے آپ اپنے اُستاد کی تقلید کبھی نہ کیجئے اور اگر عشق نہیں کر سکتے تو شاعری عشق کرنے والوں کی سی کیجئے۔

نیاز

مکتوبات نیاز

کی کتابت شروع ہوگئی ہے، اس لئے نگار میں اب اس سلسلہ کو بند کر دینا ہی مناسب ہے۔ اسوقت تک تقریباً ۱۵۰ خطوط شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان سے کہیں زیادہ شائع ہونے کو نئے جو اب کتاب میں درج کئے جائیں گے۔

یہ کتاب نگار کے نصف سائز پر تقریباً ۴۰۰ صفحات کو محیط ہو گی، اور جناب نیاز کی تصویر بھی اس میں شامل ہو گی۔

کاغذ اور کتابت و طباعت کا بھی خاص اہتمام پیش نظر ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

دخترِ کفش دوز

وہ ہنوز مصروفِ استراحت تھی - ایک نیم عریاں عالم میں --- گردن شانہ تک کھلی ہوئی تھی اور دونوں شانے نصف سینہ تک برہنہ تھے --- لبوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں، نرم مخملی تکیہ میں اسکے سر کے وزن سے ہلکا سا نشیب پیدا ہوگیا تھا، گویا یہ بھی مسکرا رہا تھا -

وہ کچھ سوچ رہی تھی، شاید کوئی خواب دیکھا تھا، وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی تعبیر معلوم کرے - دائیں ہاتھ کی نازک انگلیاں آبنوسی مسہری پر اس طرح چل رہی تھی گویا وہ پیانو بجا رہی ہے - محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ گنگنا بھی رہی ہے، بہت مدھم سروں میں - صرف اپنے ہی لئے - گنگنانا کیا ہے ؟ - جذبات جنسی کی دوشیزگی کو مبہم پیرایہ میں ظاہر کرنا !

اس کا دوسرا ہاتھ معطر، سیاہ ریشمی بالوں میں چھپا ہوا تھا، کتاں کی شبنمی رنگ کی چادر میں اس کا جسم لپٹا ہوا تھا، اور چونکہ چادر کے رنگ کو اس کے جسم کے رنگ سے علحدہ کرنے والی کوئی چیز نہ تھی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بالکل عریاں تھی -

اس نے جمائی لیتے ہوئے، ہلکی سی انگڑائی لی، اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا، کیونکہ اپنی دوسری سالگرہ کا جشن منانے کے سلسلہ میں وہ رات کو بہت دیر میں سوئی تھی --- دوسری سالگرہ اس لئے کہ محل کی چار دیواری میں آئے ہوئے اس کو ابھی صرف دو سال گزرے تھے اور اس سے قبل اس کے ابتدائی سولہ سال ایسی فضا میں بسر ہوئے تھے جہاں فکرِ معاش سے تنگ آکر انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے - وہاں جشن سالگرہ کے کیا معنی ؟

قدرت کے بھی عجیب کھیل ہیں - وہ بال جو دو سال قبل صرف گرد و غبار کے لئے وقف تھے آج پھولوں میں آسودہ نظر آتے تھے وہ سر جو خس و خاشاک سے اٹا رہتا تھا، آج زریں تاج سے مزین تھا، اس کا وہ جسم

جو ہمیشہ خشک گھاس پر لیٹنے کا عادی تھا آج مخمل و کمخواب میں بھی خشونت محسوس کرتا تھا اور اس کا وہ معدہ جو گرد و ایلوں کی آنچ پر سکی ہوئی موٹی موٹی روٹیوں کو آسانی سے قبول کر لیتا تھا، اس قدر لطافت پسند ہو گیا تھا کہ اگر دودھ بھی چبا کر نہ پیا جاتا تو سوءِ ہضم کی شکایت ہو جاتی۔ وہ پہلے ایک مفلوک الحال موچی کی بیٹی تھی اور اب ایک رئیس کی محبوبہ!

کیا وہ حسین تھی۔ ؟ یہ ایک احمقانہ سوال ہے۔ اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو محلوں میں زندگی بسر کرنے والا نواب سرسوتی ندی کے کنارے ماہی گیروں کی بستی میں جا کر چار دن ٹھہرنا بھی گوارا نہ کرتا چہ جائیکہ ہفتوں!

خود اس کے محل میں سیکڑوں پری تمثال لڑکیاں موجود تھیں، پھر اس لڑکی میں وہ کیا خصوصیت تھی جس نے نواب کو اس درجہ بیتاب بنا دیا؟ - اس کا جواب نواب ہی دے سکتا ہے۔

اس نے اپنے سیاہ لانبے بال کو جو منتشر ہو جانے ہی کے لئے سنوارے گئے تھے اپنی مرمریں انگلیوں سے درست کیا اور کسی قدر کسمساتے ہوئے کروٹ لی۔ اس کی نظر کے سامنے خوبصورت تاروں کا بنا ہوا پنجرہ دریچہ کی محراب میں لٹک رہا تھا۔ جس کے اندر ایک نہایت خوشنما چڑیا بند تھی۔ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک فلسفی کی طرح غور کرنا شروع کر دیا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کا موازنہ خود اپنی زندگی سے کیا۔ کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ دونوں کے لئے بہترین سامان خورد و نوش، بہترین آسائش، خدمت کے لئے بہترین ملازم موجود تھے۔ رہنے کی چار دیواری بھی دونوں کے لئے نہایت خوشنما اور قابل دید تھی ۔۔ مگر آزادی ۔۔۔ اُف! آزادی کا فقدان تھا۔ محل میں آنے سے قبل دیہات کی سادہ فضا میں صبح سے شام تک اس کا مشغلۂ حیات ایک غیر معین و بے ترتیب لائحۂ عمل کے تحت ہوتا تھا۔ کسی دن وہ مچھلیاں پکڑنے ندی کے کنارے چلی جاتی اور دن بھر جال لئے کنارے پر بیٹھی رہتی اور کبھی کشتی پر سوار ہو کر ساحل سے کچھ دور نکل جاتی۔ وہ خود موسیقی سے ناواقف تھی لیکن جب گاؤں کے دوسرے لڑکے مچھلیاں پکڑتے وقت گاتے تو وہ مست و بے خود ہو کر پانی میں انگلیاں تر کر کے ساحل کے قریب اُگنے والی گھاس پر چھینٹے دینے لگتی۔ گھر کا ایندھن ختم ہونے لگتا تو وہ بانس کی ٹوکری یا ٹین کا تسلہ لے کر مویشیوں کے ریوڑ کے پیچھے پیچھے جاتی اور صبح سے شام تک اتنا گوبر سمیٹ لیتی کہ اس کے اُپلے کئی ہفتے تک کافی ہو سکیں۔ اگر کسی روز اس کے باپ کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے کچے سوت کو بٹ دیتی۔ اس نے پرانی جوتیوں میں معمولی سلائی کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ کشتی میں سیر کرنے والے لوگوں کے بوٹوں پر پالش کرنا اسی کے ذمہ تھا۔ اس کا باپ ذات کا ماہی گیر لیکن پیشہ کے لحاظ سے موچی تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ جن کے ساتھ برسات کا تمام موسم وہ جھولا جھول کر گزارتی تھی وہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر "دپیا" گویا کرتی لیکن نہیں جانتی تھی کہ "دپیا" کس کو کہتے ہیں

وہ پریم کی نبسی بڑے شوق سے سنتی مگر اس جذبہ سے ناواقف تھی - کیونکہ پریم کے لفظ سے اس کے کان آشنا تھے - مگر لب ناآشنا - موسم گرما میں تمازتِ آفتاب سے اس کے بوسیدہ کپڑے پسینہ میں شرابور ہو جاتے - مگر یہاں کی عطریات کے مقابلہ میں پسینہ کی وہ بو اسے زیادہ مرغوب تھی - وہ کج فہم اور ناقص العقل ہونے کے باوجود اس رمز کو سمجھتی تھی کہ عطر پھولوں سے کشید کیا جاتا ہے اور پسینہ خود انسان کے جسم کا فشردہ ہے -

محل میں اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی - لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ پانی کے دو گھونٹ بھی پئے تو کنیز کے ہاتھوں سے - اور وہ بھی چاندی کے کٹوروں میں - اس کی روح بعض اوقات تڑپ اٹھتی تھی اپلوں کی آنچ پر سکی ہوئی جوار کی روٹیوں کے ساتھ تیل میں بھنے ہوئے سرسوں کا ساگ کھانے کے لئے - آم اسے بہت مرغوب تھے - لیکن اس طرح کہ رس ان سے ٹپک ٹپک کر کپڑے کو آلودہ کردے اور وہ خود ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے ہی ہاتھوں سے دھو کر اس آلودگی کو صاف کردے - وہ چاہتی تھی کہ جنگلی گلاب توڑتے وقت اس کی انگلی میں کانٹا چبھ جائے - محل کی چار دیواری میں سونے سے قبل اسکو اپنی سیج صدہا قسم کے پھولوں سے مزین ملتی - اور اسے یہ سن کر افسوس ہوتا کہ ایک بوڑھے مالی نے ان کو چنا ہے - اس کا خیال تھا کہ گرمی کی سہانی راتوں میں نیند کا لطف اسی وقت آسکتا ہے جب مچھر خوب کاٹیں اور انسان بیدار ہو ہو کر سو سو جائے - نہ یہ کہ مسہری کے ریشمی پردے ایک بھنگے کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیں -

یہ ضرور ہے کہ محل میں آنے کے بعد سے اس کی طبیعت کسی قدر نفاست پسند، آرام طلب اور عیش پرست ہو گئی تھی - تاہم بڑی بحث کے بعد اس نے نواب سے اجازت حاصل کرلی تھی کہ ہمیشہ سالگرہ کے دوسرے دن دیہاتی روایات کی یاد قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے سابق طرزِ معاشرت کا اعادہ کیا کرے گی - چنانچہ آج سالگرہ کا دوسرا دن تھا - اور اسی لئے وہ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ مسرور تھی - اس قدر مسرور کہ جوشِ مسرت میں اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا - اور اسی نیم عریاں حالت میں ریشمی پردہ کو حقارت کے ساتھ جھٹکتے ہوئے مسہری سے نیچے اتر آئی -

(۲)

وہ سیٹی بجاتا ہوا غیر ارادی طور پر کچھ سوچتا ہوا دریچہ کے قریب پہونچ گیا - اس کی متجسس نظریں صحنِ چمن میں کسی کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں - اس وقت وہ خود خالص مشرقی طرز کی پوشاک میں ملبوس تھا - لیکن کمرے کا باقی ماحول مغرب کی حیا سوز تہذیب کے زیرِ اثر عریانیات کا مجموعہ تھا - بالکل ننگی عورتوں کی تصویروں سے دیواروں کو زینت دی گئی تھی - یونانی صنمیات کی روایاتِ قدیم کو مادی شکل میں پیش کرنے والے مرمریں و بلوری مجسمے

طاقوں اور میزوں پر رکھے ہوئے تھے۔

نواب ابھی اپنے خیالات ہی میں محو تھا کہ دروازے پر لٹکنے والے پردہ میں جھنکار پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نسوانی قدموں کی ہلکی چاپ ۔ ایک کنیز اندر داخل ہوئی لیکن اس انداز کے ساتھ گویا طاق میں رکھی ہوئی کسی چینی کی مورت میں جان پڑ گئی ہے۔ اس نے شراب پیش کی اور نواب نے کوئی لفظ کہے بغیر اس آتش سیال سے اپنی تشنگی بجھائی۔

نواب کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ کنیزیں آتی تھیں اور کہہ جاتی تھیں کہ اب محل کی چار دیواری میں دیہاتی طرزِ زندگی کا کون سا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بستر سے اُٹھنے کے بعد بیگم سب سے پہلے اس تالاب پر گئی جس میں شوقین مزاج نواب نے پانی کے مختلف جانور پال رکھے تھے۔ رنگ برنگ کی خوبصورت مچھلیاں ۔ راج ہنس ۔ مرغابیاں ۔ قازیں ۔ سرخاب اور خدا جانے کیا کیا ۔ اس نے عنبریں بالوں کی عطریت رخساروں پر ملے ہوئے غازہ کی خوشبو، پھولوں کے گجروں میں بسی ہوئی مرمریں گردن کی مہک ۔ نرگسی آنکھوں میں تڑپنے والی سرمۂ دنبالہ دار کی ہلکی لہر ۔ صندل بھری مانگ کی گلنار رنگینی ۔ مصنوعی خال کی سرگیں ملاحت اور غرض یہ کہ ہر وہ شے جس سے تزئینِ جمال ہوئی تھی ۔ ملتانی مٹی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے ذریعہ سے ادا دُتا دور کردی ۔ گدلے پانی میں اس نے غسل کیا ، مچھلیوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا کبھی راج ہنس کو سر پر بٹھا لیا اور کبھی سرخاب کو ، اس کے نقرئی قہقہوں سے تمام فضا معمور تھی ۔ اس نے پانی کے چھینٹے دے دے کر قازوں کو ستایا ۔ پھر پاس کی جھاڑیوں میں چھپ کر اس نے کھدر اور مارکین کا لباس پہنا ۔ خود رو پودوں سے ہر قسم کے پھول توڑے اور یکجا گوندھ کر گلے میں پہن لئے ۔ اب اس کی کلائیوں میں بجائے طلائی پٹریوں اور منقش کنگنوں کے صرف کانچ کی چوڑیاں تھیں ۔ اس نے دیسی چمڑے کا گنوارہی جوتا پہنا ۔ اور پانی کا گھڑا سر پر رکھ کر چل پڑی ۔ اپنے شاہی کمروں کی طرف نہیں بلکہ دربان کے جھونپڑے کی جانب جس کو عارضی طور پر خالی کرا لیا تھا ۔ وہاں جا کر وہ چکی میں جوار پیسنے لگی اور اسی انہماک میں خدا جانے کیا گاتی رہی ۔ پھر اُپلوں کی آنچ پر تین چار روٹیاں پکائیں ۔ پالک کا ساگ سرسوں کے تیل میں بھونا اس نے کھانا کھا کر مٹی کے آبخورہ سے پانی پیا اور تنکوں کے سخت بستر پر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی ۔ اپنے ماں باپ ۔ بھائی بہن اپنی سکھیوں ۔ اپنی بھینسوں اور گاؤں میں پلے ہوئے کتوں کو یاد کر کے اس نے رونا شروع کر دیا ۔ اور اس کے آنسو آنچل میں جذب ہوتے چلے گئے ۔

:

نواب کو جب ان باتوں کی خبر ملتی تو وہ دل ہی دل میں افسردہ ہوتا۔ وہ پشیمان ہو رہا تھا کہ ایک دیہاتی لڑکی کو محل میں لاکر کیوں رکھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اس حسین دوشیزہ کو دیکھکر اس نے خیال کیا تھا کہ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ گدڑی میں لعل کو چھپا کر رکھدیا۔ اس کو اپنے محل میں لاکر وہ خوش ہوا تھا۔ کہ قدرت کی ایک زبردست غلطی کی تصحیح کردی ہے۔ لیکن اب وہ سمجھا کہ انگارے جو یاقوت کی طرح چمکتے ہیں، دراصل یاقوت نہیں، اور یہ کہ خوبصورت خوشنما سانپوں میں بھی زہر ہلاہل ہوتا ہے۔ جن کی سمیت کبھی دور نہیں ہو سکتی خواہ وہ صدہا سال تک تریاق کے انبار پر گنڈلی مارے بیٹھے رہیں۔ اس نے خیال کیا تھا کہ محل کی رنگین فضا میں اس دیہاتی لڑکی کے حُسن کو چار چاند لگ جائیں گے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ شیر کا بچہ انسان کی گود میں پل جانے کے بعد بھی اپنی بہیمانہ خصلت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ تصورات کی دُنیا میں واقعاتِ گزشتہ کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ ایک روز اپنے مصاحبوں کے ہمراہ مچھلی کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اسے کشتی میں ایک نوخیز لڑکی نظر آئی پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑوں میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا سیاہ بدلیوں میں سے چاند جھانک رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو اپنی خدمت پر مامور کرلیا۔ لیکن وہ پھولوں کو صرف آنکھ سے دیکھ لینے کا قائل نہیں تھا۔ اس لئے چلتے وقت اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ غالبًا بڈھا باپ اس ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا مگر پانچسو روپے کی کثیر رقم نے اس کی زبان بند کردی۔ دولت ناممکن باتوں کو بھی ممکن کر دکھاتی ہے۔

دخترِ دہقان جب شاہی محل میں آئی تو کئی روز تک ہر شے کو تعجب کی نگاہوں سے تکتی رہی۔ عرصہ تک اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کپڑے کے اندر سورج کی کرنوں جیسی چمک کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس قدر ہلکے اور مہین کیوں ہوتے ہیں۔ وہ صرف پکی اینٹ کے ٹکڑوں سے پاؤں مانجھنا جانتی تھی۔ کنیزوں نے اسفنج کے ٹکڑے اور ربڑ کے جھانوے دئے تو حیران رہگئی۔ کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے اور اگر بر وقت اسے منع نہ کر دیا جاتا تو شاید وہ گلگونہ یا غازہ سے ایک انگلی بھر کر منھ میں رکھ لیتی۔ اسنے بانسری کے نغمے سنے تھے۔ ہارمونیم ستار اور رباب سے اسکے کان ناآشنا تھے۔ ناچ کا مفہوم اس کے ذہن میں صرف اس قدر تھا کہ کچھ عورتیں ایک حلقہ میں کھڑی ہو کر اور گھونگھٹ نکال کر اپنے اعضا کو ایک مخصوص طریقہ پر جنبش دیں۔ کبھی ان کا سر آگے کی طرف جھکے اور کبھی پشت کی جانب، بعض دفعہ پاؤں زمین پر زور سے مارا جائے اور بعض دفعہ ہلکا۔ اور اس تمام دوران میں وہ کچھ جھینپی جھینپی سی شرمائی سی رہیں۔ محل کی بزمِ نشاط میں اس نے دیکھا کہ صرف ایک نوجوان عورت مجمع کے سامنے اس طرح رقص کرتی ہے کہ اکثر اس کا سینہ کمر تک اور ٹانگیں رانوں کے بالائی سرے تک برہنہ ہوتی ہیں۔ وہ بے حیائی کے اس منظر کو دیکھ کر ابتدا میں خود شرما جاتی تھی۔ وہ بمشکل سمجھ سکی

کہ آخر ناچ میں اس چیز پر کیوں زور دیا جاتا ہے کہ چھاتیاں اور کولھے بھی اپنی اپنی جگہ رقص کریں۔ مختلف قسم کے حرکات دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ غالباً رقاصہ ہوا کے سمندر میں تیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ بازوؤں کو شانوں کے متوازی پھیلا کر چھوٹے چھوٹے دائرے بنانا اور اس کے ساتھ ہی اُنگلیوں کو اس طرح موڑنا گویا ان پر تشنج کی کیفیت طاری ہو رہی ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے دیہاتی گیتوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا تھا جو جذبات میں ہیجان پیدا کر کے انسان کو گناہ کی ترغیب دے۔ برخلاف اس کے یہاں شعر کا ہر مصرع بذاتِ خود ایک دفترِ معصیت تھا

نواب اپنے خیالات میں محو تھا اور ابھی کسی خاص نتیجہ پر نہ پہونچا تھا کہ آیندہ اس دیہاتی لڑکی کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہ اسے اطلاع ملی کہ بیگم گوبر کا ڈھیر سامنے رکھے ہوئے اُپلے تھاپ رہی ہیں۔ آتشِ غضب اس کے سینہ میں بھڑک اُٹھی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو محل کی چار دیواری سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور دربان کے جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔

قریب پہونچ کر اس نے دیکھا کہ محل میں رہنے والی بیگم نے گاڑھے کا لباس زیبِ تن کر رکھا ہے۔ آستینیں کُہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ اور دونوں کلائیاں نجاست سے آلودہ ہیں۔ اسے آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور کسی قدر جھک کر بولی۔ "آیئے! بابو جی!"

اس کہنے کے ساتھ ہی وہ مسکرائی اور یہاں تک مسکرائی کہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ایک عورت اور خاص طور پر شباب کے بوجھ سے لدی ہوئی عورت کا تبسم جب بڑھتے بڑھتے دلفریب مگر مدہم قہقہہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ساغر و مینا کے باہم ٹکرا جانے سے جلترنگ کی ایک خاص نوع کا نغمہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس نے گاؤں میں سُنا تھا کہ امیر آدمیوں سے "بابو جی" کہہ کر بات کرتے ہیں۔ اور دیہاتی معاشرت کا خیال کر کے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ نواب کو بھی "بابو" ہی کہا جائے۔

"بابو جی! میں نے تمھارے جوتوں کو صاف کر کے چمکا دیا ہے۔ اپنے نوکر کو بھیج کر منگالو۔"

نواب نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ جھونپڑے کی دیوار کے ساتھ پانچ سات جوڑے جوتوں کے رکھے تھے۔ اسکی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ اس کی شانِ امارت کی زبردست توہین تھی کہ ایک عورت جو اس کی زینتِ آغوش بن چکی ہو ایسے ذلیل کام کرے۔ مگر کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لے کر چند طلائی سکے اپنی جیب سے نکالے اور دخترِ کفش دوز کے سامنے زمین پر ڈال کر بولا کہ "لو یہ جوتے صاف کرنے کی اُجرت ہے۔ اسے اُٹھالو۔" اس نے وہ سکے اُٹھا لئے اور چلی گئی۔ یعنی جب یہ کھیل ختم ہونے لگا تو وہ پھر حقیقت سے ہم آغوش تھی۔ (مختار)

طاہرہ دیوی شیرازی

ریاض مرحوم

ریاضؔ کی موت، ہندوستان کی موجودہ شاعری کو صدمہ پہونچانے والی ہو یا نہو، لیکن اخلاق شاعرانہ اُن کے اُٹھ جانے سے جتنا بھی سوگوار نظر آئے کم ہے۔

ریاضؔ کی سب سے بڑی خصوصیت جو متقدمین شعرا میں بھی کم نظر آتی تھی، چہ جائیکہ دور متاخرین، نجابت نفس و شرافتِ اخلاق تھی اور یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ وہ شاعر پیدا ہونے سے پہلے انسان پیدا ہوئے تھے جن کو اُن سے ملنے کا موقع نہیں علاوہ صرف اُن کی شاعری پر سر دھنتے تھے اور جو اُن سے مل چکے تھے، وہ انکی انسانیت پر جان دیتے تھے۔ ایسے لوگ جو عمر بھر کسی سے بدگمان نہ ہوئے ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی دل میں کسی کی طرف سے جذبۂ انتقام کو گوارا نہ کرتے ہوں اور جو ایک بار رشتۂ محبت جوڑ لینے کے بعد اس کا توڑنا کفر سمجھتے ہوں۔ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اس ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود بھی ناممکن تھا کہ وہ خیرآباد سے لکھنؤ تشریف لائیں اور فرداً فرداً ہر اس شخص سے جاکر نہ ملیں جس سے کچھ بھی رسم قائم ہوگئی ہے۔ یقیناً وہ مراسم بڑھانے کی کوشش نہ کرتے تھے، لیکن جو اسلوب ملنے کا ایک بار قایم ہو جاتا تھا اس کو نباہنے کے لئے وہ ہر ممکن تکلیف گوارا کر سکتے تھے۔ گرمی کی دھوپ میں پسینے سے شرابور ہو رہے ہیں، ایک ایک قدم اُٹھانا بار ہے، دم پھول رہا ہے، ہونٹ خشک ہیں، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، لیکن ریاض کو آنا اور ملنا ضرور خواہ وہ ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو۔ ان کی عمر کا آخری حصہ اقتصادی دشواریوں کی وجہ سے نہایت سختی سے بسر ہوا اور دیگر ذاتی و خاندانی افکار کی وجہ سے وہ سراپا درد و الم تھے، لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ دوسرا اُن کی اس کیفیت کو محسوس کر سکتا۔ وہ شوخی و ظرافت، وہ رنگینی و رعنائی جو جواں سال ریاض کے "فتنہ"، "ریاض الاخبار" میں نظر آتی تھی، بالکل وہی نوّے سال کے بوڑھے ریاض میں بھی پائی جاتی تھی، اور حیرت ہوتی تھی کہ جس شخص کا بڑھاپا اس قدر شگفتہ ہے، اس کی جوانی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ جن حضرات کو ریاض کی صحبت و معیت

نصیب ہوئی ہے، اُن سے پوچھئے کہ ریاض کیا چیز تھے، اور وہ اپنے احباب کی زندگی میں کتنے خلا پیدا کرکے گئے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کا شاندار لہجہ، وہ شوخی وظرافت اور وہ خالص ادبی رنگ کی بات چیت ــــ جس وقت وہ اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات بیان کرتے تھے تو سننے والا "لذتِ تقریر" میں اس قدر محو ہو جاتا تھا کہ شاید ہی زاہدانِ مرتاض کو یہ محویت کبھی عبادت میں پیدا ہوتی ہو۔ اور بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ ریاض ہر وقت گفتگو کرتے رہیں اور ہم خاموش بیٹھے سنا کریں۔

پھر جو رنگ اُن کی گفتگو کا تھا وہی اُن کی تحریر کا تھا۔ نگار میں جو خطوط اُن کے شائع ہوئے ہیں وہ آج ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی خراجِ تحسین حاصل کریں گے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے ریاض نے جو عزت و شہرت حاصل کی، اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ وہ اپنے رنگ کے تنہا کہنے والے تھے اور اس "انفرادیت" میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔

الغرض ریاض کی موت ایسا معمولی سانحہ نہیں جسے آسانی سے فراموش کیا جاسکے، اور یہ ملک و قوم کی انتہائی بدنصیبی ہوگی اگر اس نے اس جوہر گرانمایہ کی یادگار قائم رکھنے کی کوشش نہ کی۔

پھر اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اُن کے کلیات کو شائع کیا جائے جسے وہ اپنے قلم سے مرتب کرکے چھوڑ گئے ہیں اور دوسری یہ کہ نثرِ اُردو پر جو احسانات انھوں نے کئے ہیں، ان کو سامنے لایا جائے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ریاض الاخبار اور فتنہ کے فائل فراہم کرکے خود اس خدمت کو انجام دوں اور میں بہت شکر گزار ہوں گا اگر اس باب میں اہلِ ذوق میری اعانت فرمائیں گے۔

نیاز

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم-اے-ایل ایل-بی منصف سہارن پور

"گلدستۂ بہار" فارسی اور اُردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی دیوان کی ضرورت نہیں ہے۔ چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں علم ادب میں گلدستہ بہار ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرع۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۲۰۳ صفحے۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(در۔ بیگم۔ از مسوری)

جولائی کے نگار میں آپ کا ایک خط شایع ہوا ہے جو مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکا آپ نے جو یہ عنوان قایم کیا ہے، ممکن ہے صرف ادبی اختراع ہو لیکن اصل مکتوب کے دیکھنے کے بعد چونکہ خواہ مخواہ واقعیت و حقیقت کا سا اثر دل پر ہوتا ہے اس لئے غالباً عنوان بھی صحیح ہوگا، پھر کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کا یہ خط نگار کے ذریعہ سے بھی مکتوب الیہ تک نہ پہونچا ہوگا اور کیا حقیقتاً آپ کا مقصود یہ نہ تھا کہ اس ترکیب سے کوئی اسے دیکھ لے؟ بہر حال اگر یہ سب کچھ حقیقت ہے تو بہت پر لطف حقیقت ہے اور تفصیل سننے کے لئے جی بیچین ہے، لیکن آپ کیوں کہنے لگے؟

(نگار) عام طور پر راز چھپانے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی سے اس کا ذکر ہی نہ کیا جائے، لیکن ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو مشتہر کر دیا جائے اس طریق پر کہ ہر شخص اس کا مفہوم اپنے ذوق کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ قرار دے۔ پھر اگر کسی میں یارائے ضبط نہ ہو یا اتنا کہنے کا بھی موقعہ حاصل نہ ہو کہ:۔

یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن

تو بہتر صورت وہی ہے، جو آخر میں عرض کی گئی —— مگر خدارا، اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے یہ خط اسی اُصول کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

آپ نے تو خیر اسی حد تک دلچسپی لی کہ مجھ سے داستانِ محبت پوچھنے بیٹھ گئیں، میں کیا کرتا اگر آپ

بھی بعض دوسری خواتین کی طرح یہ کہہ اُٹھتیں کہ "ہو نہ ہو اس میں ہمارا ہی ذکر ہے"

باور کیجئے کہ متعدد خواتین کے خطوط اس بارہ میں میرے پاس آئے اور ان سب نے اپنی ہی تصویر میرے مکتوب میں دیکھی۔ درانحالیکہ ان میں سے کسی نے مجھے خط لکھنے سے باز نہیں رکھا اور اُن سے میری مراسلت ہنوز جاری ہے

شایع شدہ مکتوب کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر واقعی اس خط میں کسی حقیقت کا اظہار ہے تو اُس کے لکھنے کا سبب صرف یہ تھا کہ مجھے آیندہ خط و کتابت سے باز رکھا گیا تھا۔ پھر میں حیران ہوں کہ وہ خواتین جنھوں نے مجھ پر یہ ظلم روا نہیں رکھا، وہ کیونکر اپنے آپ کو اس خط کا مخاطب جان کر اک دوسرے نوع کا ستم مجھ پر توڑنا پسند کرتی ہیں۔ سچ ہے

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں

جب مقصود ظلم ہی کرنا ٹھیرا تو پھر "این و آں" کا کیا سوال — فریاد کی کوئی ے نہیں، تو حُسن شعبدہ کار کیوں کسی "آئین" کا پابند ہو؟ انھوں نے اگر ظلم پر کمر باندھی ہے تو اب آئے اور ساری دنیا انھیں کا ساتھ دے۔

آتشم تیز ست و داماں می زنم

اب رہگیا سوال "حقیقت" کا سو حیران ہوں کہ اس باب میں کیا کہوں، آج اگر کوئی "حرف آرزو" زبان پر آجاتا ہے، تو دُنیا چونک پڑتی ہے اور اس میں داستان محبت کی جستجو کرنے لگتی ہے، حالانکہ کل کا دن جب تمنا کوئی لفظ نہ بن سکی تھی اس سے کہیں زیادہ لبریز محبت تھا۔ مگر وہ ختم ہو گیا اور اپنے ساتھ وہ سب کچھ لے گیا جو اس کا تھا "حال" پر گفتگو فضول ہے لگن میں خاکستر پروانہ کی کس کو پرواہ ہوتی ہے، رہگیا مستقبل سو اُس کا اندازہ حال سے ہو سکتا ہے۔

برقِ یمانی بجست، بادِ بہاری نخاست
طاقتِ مجنوں برفت خیمۂ لیلیٰ کجاست

معاف فرمائیے، جو خط میں لکھا گیا تھا وہ بھی اور جو اسوقت لکھ رہا ہوں وہ بھی سب باتیں ہی باتیں ہیں، کہاں کا عشق، کیسی داستان محبت۔ نہ در سینہ آتش نہ در دیدہ آب

یوں اگر آپ کو کسی کا زخم تازہ کرنے میں لطف آتا ہے تو بات ہی اور ہے

باب الاستفسار

حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو

(جناب سید ابو تراب صاحب - حیدر آباد دکن)

نگار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ احادیث کے قایل نہیں ہیں، درانحالیکہ شریعت اسلامی کا نظام انھیں پر منحصر ہے - اگر وقت و مصلحت اجازت دے تو آپ اپنے تفصیلی خیالات اس باب میں قلمبند فرمایئے اور اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو اصولِ حدیث اور فنِ حدیث پر بھی روشنی ڈالئے - مدعا یہ ہے کہ اس بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں -

---

(نگار) ظہورِ اسلام سے قبل بھی اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے اسلاف و اکابر یا آب و جد کے مراسم و شعائر اور واقعات تاریخی کی روایات محفوظ رکھا کرتے تھے اور ان سے ہٹنا معیوب خیال کیا جاتا تھا ----

جب رسول اللہ مبعوث ہوئے اور عربستان کی ذہنی و دماغی دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہوا تو اس کے ساتھ اس عادت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی - یعنی روایات قدیمہ کے محفوظ رکھنے کے بجائے رسول و صحابہ کے اقوال و افعال کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی اور یہ تھی اولین بنیاد فنِ حدیث کی -

پھر چونکہ کسی واقعہ کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر اس پر ہے کہ اس کے بیان کرنے والے نے خود اسے دیکھا ہو، یا وہ اس سے قریب تر زمانہ میں پایا جاتا ہو، اس لئے سب سے زیادہ معتبر راوی صحابہ مانے گئے،

جو رسول اللہ کے ساتھ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے تھے، اس کے بعد تابعین کا درجہ قرار پایا جنھوں نے صحابہ کا زمانہ دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا جو تابعین کے دیکھنے والے تھے وہلم جرا۔۔۔ اس لئے حدیث کے دو حصے ہوگئے ایک وہ جسے اسناد کہتے ہیں اور دوسرا متن، یعنی ایک حصہ وہ جس میں یہ بتایا جائے کہ کن کن راویوں کے ذریعہ سے روایت بیان کی گئی ہے اور دوسرا حصہ خود اس واقعہ یا روایت کا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب کوئی شخص کسی واقعہ کی روایت کرتا تھا تو اسے یہ بھی ثابت کرنا پڑتا تھا کہ واقعی رسول اللہ نے ایسا فرمایا یا ایسا کیا اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ معتبر راویوں کا سلسلہ بیان کردے۔

اس امر کی تنقید کے لئے کہ جن راویوں کے سلسلہ سے حدیث بیان کی جاتی ہے وہ معتبر ہیں یا نہیں، اور یہ کہ اخلاقی و ذہنی حیثیت سے ان کا کیا مرتبہ ہے، ایک علٰحدہ فن کی بنیاد پڑی جسے فنِ رجال کہتے ہیں [۱] اور اس تنقید کا اصطلاحی نام "الجرح والتعدیل" قرار پایا۔

ظاہر ہے کہ تنقید کے سلسلہ میں بعض روایتیں زیادہ معتبر مانی گئی ہوں گی اور بعض کم، اس لئے راویوں کی حیثیت، الفاظ روایت کے اختلاف، اور سلسلۂ روایت کے لحاظ سے حدیث کی بہت سی تقسیمیں ہوگئیں۔

(۱) اگر راویوں کا پورا سلسلہ نہایت معتبر ہے اور حدیث میں کوئی بات عقیدۂ مروجہ کے خلاف نہیں ہے تو ایسی حدیث کو "صحیح" کہتے ہیں۔

(۲) اگر راویوں کے سلسلہ میں کوئی راوی کم درجہ کا ہے یا اسناد مکمل نہیں ہے تو ایسی حدیث کا نام "حسن" قرار پاتا ہے۔

(۳) اگر راوی مشتبہ ہے یا نفس روایت میں کوئی بات شبہ کی ہے تو ایسی حدیث کا نام ضعیف رکھا جاتا ہے۔

(۴) اگر راوی نے قول رسول کے الفاظ کے بجائے کہیں کہیں خود اپنے الفاظ استعمال کئے ہیں تو ایسی حدیث کو مدرج کہتے ہیں۔

(۵) اگر راوی صرف ایک ہے اور اس کی روایت ضعیف سمجھی جاتی ہے تو ایسی حدیث کو متروک کہتے ہیں۔

(۶) اور اگر کوئی روایت بہ لحاظ روایت و مفہوم بالکل غلط مانی جاتی ہے تو اسکا اصطلاحی نام موضوع ہے۔

---

[۱] اس فن کی مشہور کتابیں طبقات ابن سعد، طبقات الحفاظ، اصابہ، اسد الغابہ، اور کتاب الضعفاء ہیں۔

پھر چونکہ احادیث میں صرف رسول ہی کے اقوال و افعال سے بحث نہیں ہوتی بلکہ صحابہ و تابعین کے حالات و اقوال کی روایت کو بھی حدیث کہتے ہیں اس لئے ایک تقسیم اور ہوئی یعنی

(۱) اگر کسی حدیث میں رسول اللہ کا ذکر ہے تو اسے مرفوع کہیں گے۔

(۲) اگر صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہے تو اس کا نام موقوف ہوگا۔

(۳) اگر تابعین کے اقوال و افعال بیان کئے گئے ہیں تو اسے مقطوع کہیں گے۔

اسناد کے لحاظ سے ایک اور تقسیم احادیث کی کیجاتی ہے۔

(۱) اگر روایت کا نہایت معتبر و غیر منقطع سلسلہ کسی صحابی تک پہونچتا ہے تو اُسے مُسند کہتے ہیں۔

(۲) اگر راویوں کا سلسلہ اس طرح کا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے قسم و حلف کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مار کر روایت بیان کی ہے تو ایسی حدیث کو مسلسل کہتے ہیں (مسلسل الحلف اور مسلسل الید)

(۳) اگر اسناد مکمل بھی ہیں اور مختصر بھی یعنی آخری راوی اور اول راوی کے درمیان بہت کم واسطے ہیں تو ایسی حدیث کو عالی کہتے ہیں۔

(۴) اگر راویوں کا سلسلہ غیر منقطع ہے تو ایسی حدیث کو متصل کہتے ہیں

(۵) اگر یہ سلسلہ بیچ سے ٹوٹ گیا ہے۔ یعنی تابعین ۔ کے سلسلہ کا کوئی راوی نہیں ہے تو منقطع کہتے ہیں۔

(۶) اگر کوئی بات رسول اللہ کے متعلق کسی تابعی نے بیان کی ہو اور اسے نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ کس صحابی سے اس نے سُنا تو ایسی حدیث کو مُرسل کہتے ہیں۔

(۷) اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو "عن فلاں" و "عن فلاں" سے بیان کی گئی ہے یعنی صرف سماعی اسناد ہے تو اُسے معنعن کہتے ہیں۔

(۸) اگر کسی حدیث میں کوئی ایک راوی بھی غیر متعین ہے۔ تو اُسے مبہم کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور تقسیم باعتبار طریق روایت بھی کی گئی یعنی ایک ہی حدیث کتنے لوگوں نے علحدہ علحدہ بیان کی ہے۔ یعنی

(۱) اگر کوئی حدیث علحدہ علحدہ بہت سے لوگوں نے بیان کی ہے اور وہ سب ثقہ و معتبر ہیں تو اسے متواتر کہتے ہیں۔

(۲) اگر کم از کم تین معتبر طبقوں کے راویوں نے اسے بیان کیا ہے تو مشہور کہتے ہیں۔

(۳) اگر علحدہ علحدہ دو راویوں نے روایت کی ہے تو عزیز کہتے ہیں۔

(۴) اگر ایک ہی راوی ہے تو آحاد کہتے ہیں۔

(۵) اگر صرف ایک تابعی نے روایت کی ہے تو غریب مطلق کہتے ہیں۔

ہر چند یہ تمام تقسیمیں جو بیان کی گئی ہیں ان پر تمام علماء کا اتفاق نہیں ہے اور مفہوم کے لحاظ سے ائمۂ فن باہم گر مختلف ہیں، لیکن ہمارا مقصود اس اظہار سے صرف یہ بتانا ہے کہ احادیث کی چھان بین میں کتنی کاوش سے کام لیا گیا اور رسول اللہ یا صحابہ کے اقوال و افعال کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے کس قدر بلیغ کوششیں صرف کی گئیں۔

اول اول یہ دستور تھا کہ احادیث زبانی روایت سے حاصل کیجاتی تھیں یعنی اگر معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی شخص کو کسی حدیث کا علم ہے تو شایقین اس کے پاس جاتے تھے اور اس سے سُنکر یاد کر لیتے تھے، یا یہ ہوتا تھا کہ راوی کسی حدیث کو بیان کرتا تھا اور لوگ اسے لکھ لیتے تھے اور دوبارہ اس کو سُنا کر اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحت کر لیتے تھے اور راوی اس کی شرح بھی بیان کر دیتا تھا۔ پھر وہ لوگ جو احادیث کو اس طرح قلمبند یا یاد کر لیتے تھے وہ دوسروں کو اسی طور سے بتاتے تھے، حتےٰ کہ رفتہ رفتہ زبانی روایت کا دستور بند ہو گیا اور تحریری روایت کا رواج قایم ہو گیا۔

جمع احادیث کی اول اول یہ صورت تھی کہ راوی یا رجال کے لحاظ سے اُن کی ترتیب قایم کی گئی، اور ایسے مجموعہ کو مُسند کہتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں "مُسند احمد بن حنبل"، خاص شہرت رکھتا ہے لیکن بعد کو متن کے مفہوم کے لحاظ سے ترتیب قائم کی گئی اور ایسے مجموعوں کا نام "مُصنّف" قرار پایا۔ اس قسم کے مجموعوں میں بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ خاص مرتبہ کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں علی الخصوص بخاری و مسلم جو صحیحین کے نام سے موسوم ہیں کہ اگر ایک بھی کوئی روایت ان دونوں میں پائی جائے تو پھر اس سے انکار کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حضرات شیعہ کے نزدیک صرف وہ روایات قابل اعتبار ہیں جو جناب علی یا اُن کے متبعین کے وساطت سے پہونچی ہیں، چنانچہ اس اُصول کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ کتابیں ان کے یہاں مرتب ہوئی ہیں :-

(۱) الکافی محمد بن یعقوب الکلینی کی (۲) من لا یستحضرہ الفقیہ محمد بن علی بابویہ القمی کی۔ (۳) تہذیب الاحکام، (۴) الاستبصار فی ما اختلف فیہ الاخبار محمد الطوسی کی (۵) نہج البلاغہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقوال

جناب علی کا مجموعہ ہے۔ یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کتب احادیث کی تدوین میں کتنی محنت و کاوش سے کام لیا گیا لیکن آپ حیران ہو جائیں گے جب میں یہ کہوں گا کہ باوجود اس تمام حزم و احتیاط کے بھی کتب احادیث کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں اور اُن پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں، تاریخی و سیاسی بھی اور نفسیاتی بھی۔

جس وقت آپ غور کریں گے کہ روایت احادیث کی ابتدا کب سے ہوئی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس کی سلطنت و حکومت پھیلتی جا رہی تھی، مسیحی مذہب کے پیرو، موسوی مسلک کے متبعین، فلسفۂ یونان کے ماننے والے، ایران کے آتش پرست اور بودھ مذہب کے تارک الدنیا لوگ، سبھی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑ رہا تھا اور اُن سب کے تمدن و اخلاق، مذہب و اعتقاد کے مقابلہ میں اُن کو اسلام کا مطالعہ کرنا اور اسلامی شریعت کا منضبط کرنا ضروری تھا، پھر ظاہر ہے کہ انھیں بات بات میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہوگی کہ رسول اللہ کا فلاں امر میں کیا طرزِ عمل تھا، کیا ہدایت فرمائی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس نے روایت احادیث کی بنیاد ڈالی۔ پھر چونکہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی لوگوں میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اور ہر جماعت اپنی تائید میں رسول ہی کی حدیث کو پیش کرتی زیادہ موثر جانتی تھی، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد ہی روایت حدیث و وضعِ حدیث کی بنیاد پڑ گئی۔ کیونکہ جب دو مخالف جماعتوں میں سے ہر ایک اپنی موافقت میں حدیث پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُن میں سے ایک ضرور کوئی جھوٹی ہوگی اگر دونوں نہ ہوں۔ پھر صحابہ کے بعد جب عہد بنی اُمیہ و بنی عباس میں مصالح سیاسی کے لحاظ سے ہر ایک جماعت کو اپنی تائید میں بہت زیادہ ضرورت نقل احادیث کی پڑی تو اسوقت مستقل ٹکسالیں وضع حدیث کی قائم ہو گئیں اور حکومت کے اثر، روپیہ کے زور سے جس امیر و خلیفہ نے جس قسم کی حدیث کی ضرورت ہوئی فوراً ڈھلوا لی۔ چنانچہ کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ خود امراء کے پاس جا جا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو مہیا کر دی جائے۔ اسی کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی اس لئے لوگوں میں بالطبع یوں بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی۔

اسی سلسلہ میں نفس روایت کی اہمیت پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یعنی جو احادیث روایت کی گئی ہیں وہ بالفاظ رسول روایت ہوئی ہیں یا صرف مفہوم لے لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتب احادیث کی تدوین رسول اللہ

کے کم ازکم دو سو سال بعد شروع ہوئی ہے اور یہ امر کسی طرح قرین عقل و قیاس نہیں کہ اتنے زمانہ کے بعد درجنوں راویوں کے ذریعہ سے جو روایتیں فراہم کی گئی ہیں ان کا مفہوم بھی وہی باقی رہا ہوگا جو رسول اللہ کا مقصود تھا، چہ جائیکہ الفاظ نبوی ۔۔۔ ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ایک ہی بات مختلف لوگوں کی زبان سے خدا معلوم کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ہر راوی خود اپنی عقل آرائی سے کام لیکر اصل مفہوم میں ضرور کچھ نہ کچھ تصرف کر دیتا ہے۔

غور فرمائیے کہ رسول اللہ چار آدمیوں کے سامنے کسی وقت کوئی بات ارشاد فرماتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک علحدہ علحدہ اس کا ایک مفہوم قرار دیکر اس کی روایت کرتا ہے، پھر کیا یہ ممکن ہے کہ سب کے سب کسی ایک بات پر متفق ہوں یا سب نے رسول اللہ کا حقیقی مدعا معلوم کر لیا ہو، یا اُن کے الفاظ یاد رکھے ہوں۔ پھر اسی کے ساتھ جس وقت اس امر پر غور کیا جائے گا کہ اسوقت رسول اللہ کا لب و لہجہ کیا تھا، کس سلسلۂ سخن میں کیا بات ارشاد ہوئی تھی، آپ کا روئے سخن کس طرف تھا تو یہ اُلجھنیں اور زیادہ بڑھجاتی ہیں اور کبھی کسی حدیث کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسول اللہ ہی کا ارشاد ہے۔ یہی سبب تھا کہ متقدمین صحابہ میں سے بعض، سرے سے روایت احادیث ہی کو پسند نہ کرتے تھے اور بعض محدثین نے روایت بالمعنی کو کبھی جایز قرار نہیں دیا۔ لیکن ضرورت زمانہ نہ روایت احادیث سے لوگوں کو باز رکھ سکی اور نہ روایت بالمعنی کی روک تھام ہو سکی۔

رسول اللہ کے بعد تاریخ اسلام میں جتنی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں، آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی خلافت کے مسئلہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے اور ہر چند بظاہر اُن میں کوئی تصادم تو نہیں ہوا لیکن دل دونوں کے علحدہ تھے، خلیفۂ اول کے بعد جب خلیفۂ دوم کے انتخاب کا وقت آیا تو اس اختلاف میں اور زیادہ قوت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں یہ پوری طرح نمایاں ہو گیا اور خلیفہ چہارم کے عہد میں کھلم کھلا ٹھن گئی۔ پھر غور فرمائیے کہ جب اتنی مختلف جماعتیں موجود ہوں اور علوئین و خوارج، اموئین و عباسئین وغیرہ کے متصادم اغراض نے شیرازہ کو درہم برہم کر رکھا ہو اور ایک ہی سرزمین کے باشندے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ تو ایسے زمانہ میں احادیث کی روایت کیا اہمیت رکھ سکتی ہے جبکہ ہر ایک اپنی موافقت میں احادیث ہی کو پیش کرتا تھا۔ اسلام میں نماز سے زیادہ اہم عبادت کوئی نہیں جسے رسول اللہ روزانہ متعدد بار ادا کرتے تھے لیکن انھیں اختلاف روایات کے وجہ سے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ

رات دن میں کتنی بار نماز پڑھتے تھے اور کس طرح پڑھتے تھے، کوئی کہتا ہے کہ آپ ہاتھ کھول کر ادا کرتے تھے اور کوئی ہاتھ باندھ کر ادا کرنے کا قایل ہے۔ کوئی رفع یدین کرتا ہے، کوئی نہیں، کوئی آمین بالجہر کا موید ہے کوئی مخالف پھر جب نماز ایسی اہم چیز کا صحیح حال انھیں اختلاف احادیث کے وجہ سے نہ معلوم ہو سکا تو اور دوسری باتوں کا کیا ذکر ہے۔

آپ صحیحین کو اُٹھا کر دیکھئے جو سنیوں میں نہایت معتبر کتابیں حدیث کی سمجھی جاتی ہیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ اہم ترین مسایل میں بھی باہدگر متعارض و مخالف احادیث ان میں پائی جاتی ہیں، چہ جائیکہ فروعی مسائل کہ اگر ان میں کوئی شخص احادیث کی پابندی کرے تو ایک ہی وقت میں کافر و مسلمان دونوں بن سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام بخاری وغیرہ نے وہی احادیث جمع کی ہیں جو ان کے اعتقاد و یقین کے مطابق صحیح تھیں اور یہ بھی درست ہے کہ انھوں نے کافی تحقیق و تنقید سے کام لیا، لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اب اس میں چون وچرا کی گنجایش باقی نہیں ہے، اُسی وقت درست ہو سکتا ہے جب یہ ان لیا جائے کہ جتنی عقل و فراست تھی وہ سب بخاری پر ختم ہوگئی اور ان کے بعد کوئی صاحب عقل پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے، لیکن اگر یہ تسلیم کرنا بجائے خود عقل کے منافی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی کتب احادیث تنقید کا محل نہ قرار پائیں اور آنکھ بند کرکے اُن کو تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ کتنی ہی معارض، کتنی ہی خلافِ عقل اور کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں۔

روایت کے ساتھ ساتھ ائمۂ فن نے چند اُصولِ درایت بھی مقرر کر دئے ہیں، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے عجالۂ نافعہ میں جن اصول درایت کا ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) اگر کوئی روایت تاریخ مشہور کے خلاف ہو تو صحیح نہیں

(۲) اگر وقت و حال کا قرینہ اس کے خلاف ہو تو بھی باور نہ کرنا چاہئے۔

(۳) اگر مقتضائے عقل و شرع کے خلاف ہو تو بھی ایسی حدیث قابل اعتبار نہیں۔

(۴) اگر کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو رسول اللہ کے اخلاق کے منافی ہے تو بھی اسے رد کر دینا چاہئے۔

اسی طرح امام سخاوی نے ابن جوزی سے جو اصول درایت بیان کئے ہیں وہ بھی قریب قریب اسی کے ہیں۔ لیکن آپ کتب احادیث کو اُٹھا کر دیکھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کتنی حدیثیں اُصولِ درایت کے معیار پر ٹھیک اُترتی ہیں۔ شاید ہزار میں دس بیس!

۱ اگر احادیث کی تقسیم ان کے مطالب کے لحاظ سے کیجائے تو حسب ذیل بڑی بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔

۱- تعلیم عقاید و عبادت و اخلاق -

۲- پیشین گوئیاں اور قصص و حکایات -

۳- احکام شریعت یا معاشری قانون -

۴- مابعد الطبیعیات (یعنی حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت، عذاب و ثواب وغیرہ وغیرہ)

ظاہر ہے کہ ان ابواب میں سب سے زیادہ محفوظ و ناقابل اعتراض باب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو پہلا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی اپنی جزئیات میں اختلافات سے خالی نہیں اور روایتاً و درایتاً اس پر بھی تنقید ہو سکتی ہے۔

دوسرا باب بالکل اسرائیلی روایات سے بھرا ہوا ہے اور چونکہ عیسوی و موسوی مذہب کے اثرات رسول اللہ کے بعد بھی بہت کچھ باقی تھے اس لئے لوگوں نے ان مذاہب کی روایتوں کو نقل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور اس کی توثیق کے لئے ان روایتوں کو رسول اللہ سے منسوب کر دیا۔ پیشین گوئیوں کی حدیثیں جتنی ہیں وہ سب ناقابل اعتبار ہیں، کیونکہ ہر زمانہ میں ہر شخص نے اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ایسی حدیثیں گھڑ کر مطلب برآری کرنا چاہی ہے۔

احکام شریعت کے متعلق بھی احادیث میں بکثرت اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور اسی لئے اسلام کی فقہ میں کئی اسکول ہو گئے ہیں۔ پھر چونکہ ہر اسکول اپنی تائید میں احادیث ہی پیش کرتا ہے اس لئے لامحالہ ان سب کو موضوع قرار دیا جائے گا، کیونکہ اب یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ واقعی رسول اللہ نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔

وہ احادیث جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہیں وہ بھی یکسر موضوع ہیں اور اسلام میں جو غیر مذاہب کے عناصر شامل ہو گئے تھے اُن کے زیر اثر یہ سب کچھ بعد کو بڑھایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ اس سے مختلف نہیں ہے جو مذاہب قدیمہ کے خرافیات میں پایا جاتا ہے۔

ان حالات کے ماتحت اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو تمام کتب احادیث کو سامنے رکھکر از سر نو جدید معیار تنقید کے لحاظ سے پوری طرح ریسرچ کیا جائے اور واقعی جو احادیث رسول اللہ کی ہوں انھیں متعین رکھ کر باقی کو نظر انداز کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے (اور یقیناً ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارے یہاں کے علماء کو نہ اس کا سلیقہ ہے نہ ضرورت) تو پھر محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے بالکل علحدہ ہو کر کیا جائے۔

کسی قول یا فعل کو رسول اللہ سے منسوب کر دینا اتنی بڑی ذمہ داری کا کام ہے کہ دوسری تیسری صدی

ہجری میں امام بخاری وغیرہ تو اس کو بیباکانہ انجام دے سکتے تھے جب عقول انسانی زیادہ ترقی یافتہ نہ تھیں اور مذہب کے مفہوم سے قدامت پرستی وعجوبہ پرستی جدا نہ ہوئی تھی، لیکن آج، اس زمانہ میں جبکہ علوم وفنون کی ترقی نے خدائی کے ہزاروں چھپے ہوئے راز بے نقاب کر دئے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم کوہِ قاف کے متعلق رسول اللہ کی اس حدیث کو صحیح باور کرلیں گے کہ وہ ایک زمرد کا پہاڑ ہے جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا ہے اور جس کے چاروں طرف فرشتے زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں، اور جب وہ زنجیریں کھینچتے ہیں تو زلزلہ آجاتا ہے۔

پھر چونکہ کتب احادیث اسی قسم کے خلاف عقل باتوں سے بھری پڑی ہیں اس لئے اب دو ہی صورتیں رہجاتی ہیں یا تو انھیں رسول اللہ سے منسوب کر کے رسول کی توہین کیجئے یا احادیث سے قطع نظر کر کے منکر بخاری ہونے کا الزام گوارا فرمائیے۔ میں چونکہ رسول اللہ کی ذات گرامی کو بخاری وغیرہ سے ارفع سمجھتا ہوں، اس لئے ظاہر ہے کہ میں احادیث کا قایل کیونکر ہو سکتا ہوں۔

جمالستان

نیاز فتحپوری کے ۳۲ ادبی شاہکار اور افسانے جو اسی سال شائع ہوئے ہیں، اور ۵۷۰ صفحات پر محیط ہیں۔ پہلے اڈیشن کی جلدیں بہت کم رہگئی ہیں۔ اگر آپ نے اسوقت تک اپنی لائبریری کے لئے طلب نہیں فرمایا تو اب ہی۔

قیمت مجلد للعہ غیر مجلد للعہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

مجموعۂ استفسار وجواب

کے مضامین کی فہرست آپ کو اس رسالہ کے اخیر میں ملیگی اس کو ملاحظہ فرما کر فیصلہ کیجئے کہ آیا ایسا نادر ذخیرہ معلومات جو ۱۲۵ صفحات کو محیط ہے عہ میں گراں کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے اگر ابتک اسکو نہیں دیکھا تو اب طلب فرمائیے اور اپنے احباب کو بھی متوجہ کیجئے۔　منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

رعایتی قیمت میں وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں، جو عہ پیشگی بھیجدیں گے محض پیشگی نام لکھانا مفید نہیں ہو سکتا۔ منیجر نگار

مطبوعات موصولہ

تاریخ مرثیہ گوئی

یہ مختصر سا رسالہ ہے جس میں جناب حامد حسن قادری نے مرثیہ گوئی پر تنقیدی اظہار خیال کیا ہے۔ ابتدا میں عربی و فارسی کی مرثیہ گوئی کے نہایت ہی مختصر بلکہ مقتصر ذکر کرتے ہوئے اردو مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں خاندان انیس کو لے لیا ہے اور اسی پر یہ رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ مختلف مرثیوں کا اقتباس بھی پیش کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب جناب قادری نے بہت عجلت میں لکھی ہے (جیسا کہ دیباچہ میں انھوں نے خود ظاہر کیا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ اسے نامکمل ہونا چاہئے۔ ہمیں حیرت ہے کہ قادری صاحب نے اسکول کے پبلشروں کے تعمیل ارشاد میں اپنے ذوق و استعداد کی رسوائی کیونکر گوارا کی۔ یہ کتاب گیا پرشاد اینڈ سنز آگرہ سے مل سکتی ہے۔

ہندوستانی لسانیات

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے، پی اچ ڈی، سے ناظرین نگار ناواقف نہیں۔ نگار کے توسط میں آپ کے تحقیقی ادبی مضامین اکثر نگار میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب آپ ہی نے تصنیف کی ہے اور موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے پہلے حصہ میں زبان کے مقاصد اور اس کے ارتقاء پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے زبانوں کی تقسیم پر بحث کی ہے اور دوسرے حصہ میں اُردو کی آفرینش اس کی مدریجی ترقی اور مستقبل پر ناقدانہ و محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا موضوع ہمیشہ سے تحقیق زبان ہی رہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہوگا وہ ایسی چیز نہ ہوگی جو ہر جگہ مل سکے، جا بجا نقشے دے کر ہندوستان کی مختلف زبانوں کی وسعت و انتشار کو بھی سمجھایا گیا ہے اس کی قیمت عہ ہر چند حجم کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ لیکن کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کو اور زیادہ گراں ہونا چاہئے تھا۔ یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اُردو خدمات
۴۰ صفحات کا رسالہ ہے جس میں ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب نے بتایا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ نے اس وقت تک اُردو زبان کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تک وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے مختلف علوم وفنون کی (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) ۲۴۵ کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں زیادہ حصہ تاریخ، جغرافیہ ومعاشیات کا ہے، اس کے بعد تذکرہ پر زیادہ توجہ صرف کی گئی اور پھر شعر وشاعری پر ـــ طبعیات، کیمیا اور ریاضی کی کتابیں بھی فہرست میں نظر آتی ہیں اور فلسفہ واسلامیات کی بھی ـــ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان کی کسی اور درسگاہ نے اتنی قلیل مدت میں اسقدر اہم خدمات انجام دی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے دکن میں ایک نئی روح پیدا کر دی ہے اور اگر وہاں کا ماحول جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کا زیادہ اہل ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہی خدمات خدا جانے کتنی اہمیت اختیار کر لیتیں۔

Les Contes Du Hub Tarang.
میاں خوب محمد چشتی احمد آبادی ایک صوفی تھے جو سولھویں صدی عیسوی میں پائے جاتے تھے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے صوفیانہ رنگ کی مثنوی خوب ترنگ کے نام سے ۱۵۷۸ء میں لکھی تھی۔ اس کو جناب ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب نے ایڈٹ کر کے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں مختصر سا دیباچہ بھی فرانسیسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جس میں مصنف کا نہایت مختصر سا حال دیکر مثنوی کی تقسیم پر بحث کی ہے۔ اگر اس دیباچہ کا ترجمہ اُردو میں بھی کر دیا جاتا تو اہلِ ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ تحقیق زبان کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

محمد رسول اللہ
یہ ایک لکچر ہے جو جناب محمد ابراہیم صاحب سب جج نے ڈیرہ غازی خاں میں بتقریب جلسۂ یوم النبی پڑھا تھا۔ اس کا موضوع یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ نے بنی نوع انسان پر کیا احسانات کئے اور فاضل لکچرر نے اس میں زیادہ تر رسم غلامی کو سامنے رکھ کر اس موضوع پر بحث کی ہے۔

رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل مقرر کا مطالعہ اس باب میں بہت وسیع ہے اور تاریخی و تمدنی حیثیت سے بحث کا کوئی پہلو انھوں نے نہیں چھوڑا ہے۔ اسوقت تمام دُنیا جس چیز کے لئے بیتابانہ دوڑ رہی ہے وہ آزادی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس شاہد کی سب سے پہلی جھلک جس نے دکھائی وہ

محمد کی ذات تھی -

مضمون نہایت قابلیت سے لکھا گیا ہے اور ہر شخص کے نگاہ سے گزرنے کے قابل ہے - یہ رسالہ دفتر بلاغ امرتسر سے ۳ کے ٹکٹ بھیجنے پر مل سکتا ہے -

مذہب باب و بہا حصۂ اول امامیہ مشن کا سولھواں تبلیغی رسالہ ہے جس میں مذہب باب و بہا کے نشو و نما پر بحث کرتے ہوئے اس مسلک کے بانیوں کی کمزوریوں کو دکھایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک تبلیغی رسالہ میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نکالنے سے پہلے دوسروں کی آنکھ کا تنکا نکالنا ہمیشہ سے مبلغین مذاہب کا شعار رہا ہے - چونکہ ہم اصولاً تبلیغ کے سخت مخالف ہیں خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے اس لئے افسوس ہے کہ ہم اس کے مطالعہ کی سفارش نہیں کر سکتے - اس کی قیمت ۵ ہے اور سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ سے مل سکتا ہے -

چراغ ایمن جناب فکری سلطان پوری کے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - جناب فکری اپنے آپ کو اصغر و جگر کا تبع ہونا ظاہر کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ایک کے "اسرارِ سخن" اور دوسرے کے رندانہ ولولہ کو اپنے کلام سے ظاہر کر سکیں -

فکری صاحب آج کل کے نوجوان شعرا میں سے ہیں اور کافی اہلیت ترقی کی رکھتے ہیں - ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا مجموعہ شایع کرنے میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا اور ایک اُن پر کیا موقوف ہے اسوقت ہر نوخیز اہل قلم اسی خبط میں مبتلا ہے اور طلب شہرت کے جذبہ سے بیتاب ہو کر وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ کسی تصنیف کے شایع کرنے کا زمانہ عمر کے چالیس سال گزر جانے کے بعد آتا ہے — اس کی قیمت عمر ہے اور کنور احمد اعتبار حسین خاں ہارمیو ضلع سلطان پور سے مل سکتا ہے -

مساوات اسلامیہ ۹۶ صفحات کا رسالہ ہے جسے جناب شیر محمد قادری کاکوروی نے مرتب کیا ہے موضوع نام سے ظاہر ہے - اس زمانہ میں جبکہ ہندوؤں میں چھوت اچھوت کا مسئلہ پیش ہے یہ کتاب بہت برمحل ہے اور مسلمانوں کے سامنے درس عبرت و بصیرت پیش کرتی ہے - کہ وہی قوم جس نے سب سے پہلے تفریق نسل و امتیاز کو مٹانا چاہا تھا، وہی آج اس میں مبتلا نظر آتی ہے — کتاب مطالعہ کے قابل ہے - قیمت ۸ ہے اور مؤلف سے نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے -

ہمدرد صحت دہلی

ایک طبی ماہوار رسالہ ہے جو کچھ عرصہ سے دہلی سے شایع ہو رہا ہے۔ اس نے حال ہی میں اپنا "اعادۂ شباب" نمبر ۲۰۰ صفحات پر شایع کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت محنت سے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ اس میں "تجدیدِ شباب" پر علمی و اصولی بحث بھی پائی جاتی ہے اور عملی و تجربی بھی۔ یادش بخیر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے بھی تین مضمون اس میں نظر آتے ہیں، جو اسوقت ہندوستان کے واحد "مجدّدِ شباب" ہیں اور جنھوں نے حال ہی میں لکھنؤ کے ایک صاحب پر تجدیدِ شباب کا آپریشن کرکے اپنی حذاقتِ فن کو سب سے تسلیم کرا لیا ہے۔ اس کا معمولی اڈیشن ۶ر میں ہمدرد منزل لال کنواں دہلی سے ملسکتا ہے۔

موتی

مجموعہ ہے حکیمانہ و شاعرانہ اقوال کا جسے سید یوسف بخاری صاحب دہلوی نے مرتب کرکے نہایت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں جناب اختر انصاری کا تعارف نامہ ہے اور پھر راشد الخیری صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا تبصرہ۔۔ اس کے بعد قابل مولف نے ایک مقدمہ کے ذریعہ سے "اقوال" کے فلسفہ و تاریخ کو پیش کیا ہے اور پھر اقوال کا انتخاب ہے۔ انتخاب جو سو سے زاید عنوانوں پر مشتمل ہے بہت دلچسپ و مفید ہے۔ اچھا ہوتا اگر ہر قول یا فقرہ کے سامنے یہ بھی ظاہر کردیا جاتا کہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور جناب سید محمد بخاری سے گلی امام، جامع مسجد دہلی کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

قانون مباشرت

یہ کتاب ڈاکٹر فضل مبین احمد صاحب دہلوی نے مرتب کی ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے لیکن ۴۰۰ صفحات میں زیادہ سے زیادہ ۴۰ صفحات اصل موضوع پر نظر آتے ہیں باقی صفحات جنسی کمزوریوں اور ان کے علاج کے لئے وقف ہیں۔ آلاتِ جنسی کی طبی تشریح بھی ذریعۂ نقوش ظاہر کی گئی ہے اور ممسکات و ملذذات وغیرہ کے ساتھ ساتھ بعض امراض سوداوی کا علاج بھی بتایا ہے۔ اگر اس کتاب سے نسخوں کو نکال دیا جائے تو کتاب صرف چند صفحات کی رہجائے اسلئے ہماری رائے میں اس کا نام بجائے "قانون مباشرت" کے اگر "مجموعۂ نسخہ جات" رکھا جاتا تو زیادہ موزوں تھا۔ اب رہا یہ امر کہ نسخے کیسے ہیں اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جبکہ اسی قسم کے سیکڑوں نسخے ہر طبی رسالہ اور ہر طبی کتاب میں آج کل نظر آتے ہیں طباعت و کتابت اچھی ہے لیکن چار روپیہ قیمت بھی بُری نہیں۔ یہ کتاب دفتر معارف طبیہ رودگران، دہلی سے مل سکتی ہے۔

محبت کے پھول

ترجمہ ہے ٹیگور کے ڈرامہ کا جسے جناب فرید پھلی شہری نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے۔ البتہ ایک آدھ جگہ فارسی اُردو کے اشعار استعمال کیے گئے ہیں وہ بے محل ہیں، قیمت ۸ر ہے اور ۹۲ باندریہ الہ آباد کے پتہ سے ملسکتا ہے

کیوپڈ و شاعر

شاعر:-

اے کماں دارِ محبت اے شرارِ دل فروز
اے کہ تیری ہر نظر صد جلوۂ محفل فروز

تیرے تیروں سے جبینِ حسن پر سوداغ تھے
تیرے ترکش کی ہدف تھی لیلئ محمل فروز

تھیں ثریا کے تبسم میں تری انگڑائیاں
کسب کرتا تھا تری ضو سے مہِ کامل فروز

ہر ترنم تیرا سازِ حسن کی تھی زندگی
راہِ اُلفت میں تری ہر ہر ادا منزل فروز

رہبری سے تیرے طوفاں کیسے کیسے مٹ گئے
تو اندھیری رات میں اک شمع تھا ساحل فروز

شورشوں سے تیری رونق عشق کی محفل میں تھی
آگ تھا تو اور تیری آگ سب کے دل میں تھی

اب مگر کچھ سرد سی ہے گرمئ بازارِ عشق
عرصۂ ہستی میں گویا بند ہے پیکارِ عشق

ظلمتیں مایوسیوں کی دل پہ ہیں چھائی ہوئیں
کارفرما اب نہیں آتے نظر انوارِ عشق

اب مسلط ہیں نگاہِ عشق پر لاکھوں حجاب
اب کسی سینے میں پنہاں ہی نہیں اسرارِ عشق

کیا خبر تھی ایک دن یوں انقلاب آجائے گا
آہ کیا معلوم تھا بدلیں گے یوں اطوارِ عشق

حسنِ عشوہ ساز کی نذریں نہیں ہوتیں قبول
اب کہیں بھی منعقد ہوتا نہیں دربارِ عشق

اب ورائے کارواں سے درازیاں خاموش ہیں
اب نہیں پیوست پائے راہرو میں خارِ عشق

اب کہاں وہ شورشِ دار و رسن کی شوخیاں
زنگ ہے زنجیر میں خالی پڑی ہے دارِ عشق

چھن گیا فطرت سے کیا وہ رتبۂ عالی ترا
آہ کیا تیروں سے ترکش ہو گیا خالی ترا

کیوپڈ:—

مجھ کو فطرت نے بنایا پاسبانِ زندگی   میرے قدموں میں بچھایا گلستانِ زندگی
خواب سے اجسام کو بیدار میں نے کر دیا   ہر نظر سے میری لرزا آسمانِ زندگی
نصب میں نے اس کے خیمے تا بہ منزل کر دئے   جب چلا میرے قدم پر کاروانِ زندگی
حسن سے سجدے کرائے میں نے پائے عشق پر   عشق کو میں نے بنایا رازدانِ زندگی
بُلبُلِ بیتاب کو میں نے دیا درسِ فغاں   باغ میں گُل کو بنایا نغمہ خوانِ زندگی
بیستوں اور نجد میں قائم ہوا رایت مرا   جمع جس کے سائے میں تھا اک جہانِ زندگی

یوں مرتب زندگی جاودانی میں نے کی
عالمِ حسن و وفا پر حکمرانی میں نے کی

میرے ہی جلوؤں سے ہاں معمور تھا بازارِ حُسن   میرے ہی کاشانے کا اک نام تھا سرکارِ حُسن
مصر اور یونان میں قائم کئے میں نے محاذ   خسروی میں عشق کی برپا ہوئی پیکارِ حُسن
منکرانِ عشق کو چو رنگ میں نے کر دیا   خون اس کا پی لیا جس نے کیا انکارِ حُسن
میں نے قوموں کے دلوں میں پھونکدی غیرت کی آگ   چھا گئی افراد پر رخشانیِ آثارِ حُسن
شام کو میں نے سجائی زلفِ رنگینِ شفق   صبح کو میں نے بنایا مطلعِ انوارِ حُسن
میں نے کی جنسِ وفا ارزاں بساطِ دہر پر   میرے ناخن سے کھلا ہر عقدۂ دشوارِ حُسن
مشرق و مغرب میں میخانے نئے قائم کئے   کارفرما ہر طرف تھا جذبۂ سرشارِ حُسن
حُسنِ برہم کا مٹا ڈالا غرورِ عشوہ ساز   عشق کے دل کو کیا میں نے امانت دارِ حُسن

دہر میں بعد خدا فرمارروائی تھی مری
روح کی قوت سے دُنیا میں خدائی تھی مری

عالمِ فانی میں آیا رفتہ رفتہ انقلاب   نوحۂ ماتم سے بدلا نغمۂ چنگ و رباب
ابر بن کر دہر پر لعنت ہوس کی چھا گئی   حُسن اب ناکام تھا اور عشق تھا ناکامیاب
خود غرض قوموں نے اپنی حق پرستی چھوڑ دی   ذہن پر چھڑکی گئی مینائے باطل سے شراب
مادّی راہیں بنائیں قافلوں نے ہر طرف   ہو گیا یوں جادۂ روحانیت کا سدِّ باب

حسن کی آنکھوں میں اک خوابِ تغافل بھر گیا — عشق کا دل ہو گیا آشوبِ بے جا سے خراب

میں نے ترکش پر نظر ڈالی تو وہ خالی ملا — سرد ہو کر رہ گیا میری نظر کا التہاب

لوٹ لی اہلِ ہوس نے آہ وہ دنیا مری — حرص و پندار و خودی کے ڈالکر لاکھوں حجاب

تیر و پیکاں کے تصور سے بھی تھرّاتا ہوں میں
اب ہوس کے تیر اپنے دل پہ خود کھاتا ہوں میں

دیکھ وہ اک نوجواں مستِ بہارِ آرزو — جس کی نظروں سے عیاں ہے اضطرارِ آرزو

عشقِ صادق پہلے اسکی روح میں بیدار تھا — اب شبِ تاریک ہے اور خواب تارِ آرزو

عشق کے جذبوں سے پہلے تھا مقدس اسکا دل — اب اسے کہتی ہے دُنیا جرم کارِ آرزو

پہلے نازش تھی اسے سرگرمیِ جذبات پر — اب یہ ہے اعمالِ بد سے شرمسارِ آرزو

آرزو کی اس کے ہاتھوں ہو گئی مٹی خراب — کھو دیا اس کے تلون نے وقارِ آرزو

اب ہوس کی چھا رہی ہیں قلب پر تاریکیاں — پہلے اس کے دل میں روشن تھا شرارِ آرزو

تیر میرے کند ہیں ترکش مرا بیکار ہے
اب مجھے خود تیر اندازی سے اپنی عار ہے

اب بھی اک ہستی فروغِ عالم ایجاد ہے — اب بھی اک دل زندگی کی آگ سے آباد ہے

اب بھی ہیں اک روح میں اسرار کی چنگاریاں — اب بھی اک سینہ فساد و حرص سے آزاد ہے

وہ تری ہستی ہے اے شاعر وہ پیکر ہے ترا — واقفِ رازِ غمِ عالم ہے اور ناشاد ہے

جانتا ہوں تو نے دُنیا کو جگایا خواب سے — گونج اُٹھی تیری صدا تاروں میں مجھ کو یاد ہے

وہ امانت آج میں تفویض کرتا ہوں تجھے — دل مرا جس کی تپش سے مائلِ فریاد ہے

محرمِ کاشانۂ الہام ہے تیری صدا — قوتوں پر روح کی قائم تری بنیاد ہے

کام جو مجھ سے نہیں ممکن اُسے انجام دے — جاگ اے شاعر کہ دُنیا خستۂ بیداد ہے

تیرے قبضے میں متاعِ دو جہاں دیتا ہوں میں
لے تجھے یہ تیر، ترکش اور کماں دیتا ہوں میں

محمد صادق ضیا۔ چنیوٹی

مشاہدات

سحر کے نور کا عالم لئے نگاہوں میں
ضیا بکھیرتا جاتا ہے کوئی راہوں میں
لبوں میں معنیِ عہدِ شباب رخشاں ہیں
بہار جھوم رہی ہے حسین باہوں میں

شباب و شعر کی طغیانیوں کا ساماں ہے
نظر نظر میں شبِ ماہتاب غلطاں ہے
بنا ہوا ہے ہر اک عضو موجِ صہبا سے
تمھاری ذات طلسمِ بہارِ خنداں ہے

شام تھی اور شام کی تاریکیوں میں ہمنشیں
ساحلِ دریا پہ محوِ سیر تھی اک نازنیں
اُس کا پیکر، شام اور دریا حقیقی چیز تھے
بن گئے لیکن یہ سب مل جل کر اک خوابِ حسیں

اک سُبک رفتار لڑکی پیکرِ موجِ نسیم
مُنھ اندھیرے باغ کی اک کنجِ تنہا سے ندیم
آرہی تھی سایہ کی مانند اور دھندلی فضا
کر رہی تھی پیش مستقبل کی دنیائے عظیم

جب سیہ راتوں میں کالے بادلوں کے درمیاں
آنکھ جھپکاتی ہیں رہ رہ کر فلک پر بجلیاں
کپکپاتی روشنی کی مختصر ساعت میں بھی
دیکھ لیتی ہے نظر کتنے طلسماتی جہاں

عدم

ضرورت ہے شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے ـــ معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہیے، اور عمر ۳۰ سال سے زاید نہ ہو۔ یو۔پی کے باشندہ کو ترجیح دی جائیگی ـــ ایڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں ـــ خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے :۔ **ا۔ن۔** ذریعہ منیجر نگار۔ لکھنؤ

اعتماد

جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں
ہے پردہ دارِ اعتنا   بے اعتنائیٔ عشق میں
ہوتی ہے بنیادِ وفا   ہر بیوفائیٔ عشق میں
جوہر شناسِ عشق ہے   ناآشنائیٔ عشق میں
ہستی ربابِ عشق کی
مضرابِ خاموشی سے ہے
شمعِ وفا کی زندگی
بادِ فراموشی سے ہے
نقشِ مرادِ عشق ہوں   مٹ کر ابھر جاؤنگا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

دل کا سکوں لیجاؤں گا
دل سے بھلا کر دیکھ لو
داغِ جگر بنجاؤں گا
دامن بچا کر دیکھ لو
آنکھوں ہی میں چھپ جاؤں گا
آنکھیں چرا کر — دیکھ لو
ربطِ حبیب و آرزو ... ٹوٹے، نہ ٹوٹا ہے کبھی
جذبِ لطیفِ رنگ و بو ... چھوٹے، نہ چھوٹا ہے کبھی
سو بار بھی کھو دو، مگر!
کھویا نہیں جاؤں گا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے —

قیدیٔ زنجیرِ وفا!
دل بھی ہے اور دلدار بھی،
پابندِ جذبِ عشق ہیں،
مجبور بھی مختار بھی
اس میکدے میں ایک ہیں
مدہوش بھی، ہشیار بھی
پروانہ ہوں اور بالیقیں — پروانہ کر دونگا تمھیں
دیوانہ ہوں اور ایک دن
دیوانہ کر دوں گا تمھیں

بیتابیٔ دل کی قسم
تم کو بھی تڑپاؤں گا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے

آخر تو ہوں چشم آشنا خواب پریشاں ہی سہی
باقی تو ہے کوئی کشش ربطِ گریزاں ہی سہی
دیکھو تو ۔ ہو کسکا رفو میرا گریباں ہی سہی

بے خوابیاں دیکر مجھے
بے خواب ہو جاؤ گے تم
بیتابیاں دے کر مجھے
بیتاب ہو جاؤ گے تم
خلوت سے آؤ گے نکل جس روز چھپ جاؤنگا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

روش صدیقی

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۲۲ء ۴ر ۔ اکتوبر ۴ر ۔ جنوری ۲۴ء ۴ر ۔ فروری ۴ر ۔ مارچ ۴ر ۔ اپریل ۴ر ۔ مئی ۴ر ۔ جون ۸ر ۔ اگست ۴ر ۔ جنوری ۲۶ء ۴ر ۔ مئی ۴ر ۔ جون ۴ر ۔ اکتوبر ۴ر ۔ نومبر ۴ر ۔ دسمبر عہ ۔ مارچ ۲۸ء ۴ر ۔ اپریل ۴ر ۔ مئی ۴ر ۔ جون ۴ر ۔ دسمبر ۲۸ء ۸ر ۔ فروری ۲۹ء عہ ۔ مارچ ۴ر ۔ جون ۸ر ۔ مارچ ۳۰ء عہ ۔ مئی ۴ر ۔ ستمبر ۴ر ۔ اکتوبر ۴ر ۔ نومبر ۴ر ۔ دسمبر ۴ر ۔ مئی ۳۱ء عہ ۔ جولائی ۳ر ۔ اگست ۳ر ۔ ستمبر ۴ر ۔ اکتوبر ۳ر ۔ نومبر ۳ر ۔ دسمبر ۳ر ۔ جنوری ۳۲ء ۱۲ر ۔ فروری ۴ر ۔ مارچ ۴ر ۔ اپریل ۸ر ۔ مئی ۴ر ۔ جون ۴ر ۔ جولائی ۴ر ۔ اگست ۴ر ۔ ستمبر ۴ر ۔ اکتوبر ۴ر ۔ نومبر ۴ر ۔ دسمبر ۴ر ۔ جنوری ۳۳ء عہ ۔ فروری ۴ر ۔ جولائی ۴ر ۔ اگست ۸ر ۔ ستمبر ۴ر ۔ اکتوبر ۴ر ۔ دسمبر ۴ر ۔

منیجر نگار ۔ لکھنؤ

آیندہ جنوری ۳۵ء کا نگار

دہلی و لکھنؤ اسکول کی تمام اصناف شاعری پر ایک بے مثل بسیط تبصرہ ہوگا اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سے قبل آپ کو نہ کسی رسالہ میں نہ کسی بسوط تصنیف میں اتنا مفصل تذکرہ دونوں اسکولوں کی شاعری کا یکجا نظر آیا ہوگا۔

ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا، کیونکہ تمام مضامین جو معیار پر صحیح اتریں گے وہ سب کے سب درج کیے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا حجم سیکڑوں صفحات تک پہونچ جائے۔ اس ایک پرچہ کی قیمت علیحدہ دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، اس لئے آپ اپنی خریداری جاری رکھئے تاکہ یہ مجموعہ آپ کو بلا کسی مزید صرف کے مل سکے

منیجر نگار لکھنؤ

لمعات

اللہ اللہ، رنگ ہے کیا تسکیں افزا ویرانوں کا
دانشِ حیراں ڈھونڈھ رہی ہے نقشِ قدم دیوانوں کا

گیتی کے نظارے گم ہیں، حسنِ ازل کے جلوؤں میں
ہستی اک مجموعہ ہے کچھ بھولے ہوئے افسانوں کا

سوزِ محبت یکساں تھا، وہ خاک ہوئے، یہ خون ہوا
دل ہی کی یہ ہمت تھی یہ کام نہ تھا پروانوں کا

اختر دنیا بھیدوں سے معمور ہے اتنی، کیا کہئے
ہستی کوئی صداقت ہے یا عنواں ہے افسانوں کا

نکتہ چیں بھی ہے، ستم کیش و خود آرا کوئی
خامشی ہی سے کرے شرحِ تمنا کوئی

لاکھ ہر سانس میں ہو موت کا ہنگامہ بپا
دل سے جاتی ہے مگر حسرتِ دنیا کوئی

ننگ ہے اے نگہِ شوق وہ نظارۂ حسن
آپ جب تک نہ ہو مجبورِ تماشا کوئی

ذکرِ ماضی مگر اس حال میں کس طرح سنوں
نہ کہے مجھ سے یہ افسانہ خدارا کوئی

سعیِ اظہار سے کیا فائدہ اے حسرتِ دل!
دردِ پنہاں کو نہ سمجھے گا، نہ سمجھا کوئی

غم اٹھانے پہ بھی سمجھا نہ مآلِ ہستی
سطح میں، دہر میں مجھسا بھی نہ ہوگا کوئی

کیا کہوں بیکسیِ عالمِ ہجراں اختر
دے تسلی بھی جو مجھ کو نہیں اتنا کوئی

چارہ کیا تھا رسمِ ابنائے زماں دیکھا کئے
ہم دلِ برباد کو محوِ فغاں دیکھا کئے

دل نے کی اک آہ، اور پھر جل کے خاکستر ہوا
اور ہم حسرت سے سوئے آسماں دیکھا کئے

رہبردی میں کچھ اُٹھائے ناتوانی کے ستم
اور کچھ رنگِ جفائے ہمرہاں دیکھا کئے

چھوڑتی ہے کسکو ہمدم، گردش رنگ طرب
دامنِ ہمت پہ سنگِ گراں دیکھا کئے

اور ہم سے بیکسوں کا کون ہوتا غمگسار
آپ ہی ہم اپنے لٹنے کا سماں دیکھا کئے

شاید اس طرز ستم کا نقطۂ آخر ہے موت
زندگی بھر دل کو صرفِ امتحاں دیکھا کئے

زندگی بھر دل نے پائے زخم تازہ کے مزے
اُن کو اپنے حال پر یوں مہرباں دیکھا کئے

چارہ آخر کار کیا تھا ہم اسیرانِ قفس!
برق کے سائے میں اپنا آشیاں دیکھا کئے

زندگانی تھی ہماری گرچہ اک موہوم نقش
اس سُبک روحی پہ اُن کو سرگراں دیکھا کئے

زندگی محض اِک تصور، اور دنیا محض وہم
عمر بھر خوابِ بہشتِ جاوداں دیکھا کئے

چین جیتے جی نہ ہم کو مل سکا اختر کہیں
ہر جگہ روئے زمیں پر آسماں دیکھا کئے

اختر

بہار

۲۳۶ صفحات کی نہایت ہی خوشنما چھپی ہوئی کتاب ہے جس میں جناب الیاس احمد صاحب ام اے، ال ال بی منصف سہارنپور نے تقریباً ۳۰ عنوانات پر بہترین اُردو فارسی شعروں کا انتخاب یکجا کر دیا ہے۔ ہر چند اس نوع کا انتخاب کوئی چیز نہیں ہے، لیکن اس سے قبل جتنی کوششیں کی گئیں ان میں دو نقص پائے جاتے تھے، ایک یہ کہ تنوع موضوع کے لحاظ سے وسیع استقصا نہیں کیا گیا اور دوسرے یہ کہ ذوق کی پاکیزگی کا بھی کم لحاظ رکھا گیا۔ یہ کتاب دونوں نقایص سے پاک ہے یعنی انسانی زندگی کے تقریباً تمام پہلو سامنے رکھکر انتخاب کیا گیا ہے اور اتنا اچھا انتخاب کیا گیا ہے کہ بفحوائے غالب اگر الیاس احمد صاحب کے "دل کا معاملہ" رسوائی کی حد تک پہونچ جائے تو کچھ دور نہیں۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ معارف پریس اعظم گڈھ

رہنمائے تعلیم جوبلی نمبر

ماسٹر جگت سنگھ صاحب پنجاب کے اُن لوگوں میں سے ہیں، جن کو اُردو زبان کی خدمت کا شوق عشق و شغف کی حد تک حاصل ہے۔ ایک ربع صدی سے زاید زمانہ گزرا کہ انھوں نے اپنا رسالہ جاری کیا اور اس میں اتنی تدریجی ترقی کی کہ پنجاب کے دورِ حاضر میں جبکہ خاص نمبروں کے نکالنے کا شوق وہاں جنون کی حد تک پہونچ گیا ہے، انھوں نے بھی جوبلی نمبر شایع کر کے اپنی محنت و کاوش کی ایک غیر فانی مثال دنیائے ادب میں قایم کر دی۔ یہ نمبر صفحات کے لحاظ سے ایک ضخیم کتاب، مضامین کے لحاظ سے ایک مرصع دفتر اور تصاویر کی حیثیت سے ایک دلکش مرقع ہے۔

آیندہ جنوری کا پرچہ وہ دہلی نمبر کے نام سے اسی شان کا نکال رہے ہیں اور غالباً فروری نمبر جناب فیضل شاہجہانپوری کی شاعری کیلئے مخصوص ہوگا۔

فہرست مضامین مجموعۂ استفسار و جواب

(۱) غوازی مصر حشیشنون۔ اخوان الصفا (۲) گریۂ جنین (۳) قمری مہینے (۴) بوہرہ (۵) اصطلاحات تصوف کا ترجمہ
(۶) ابو العلاء المعری (۷) عبداللہ پاشا فکری (۸) نورجہاں کا ایک شعر (۹) فن کاغذ سازی (۱۰) عرب کا بازار بردہ فروشی (۱۱)
نظام شمسی کا آفتاب (۱۲) اقسام عالم۔ جبر و اختیار (۱۳) ہلالی پرچم (۱۴) سورج کا وقت طلوع و غروب بڑا نظر آنا اور کم گرم ہونا
(۱۵) بالشویزم (۱۶) باب و بہار (۱۷) نباتات کا تنفس (۱۸) جراحی اور مسلمان (۱۹) خواب کی حقیقت اور تعویذ وغیرہ (۲۰)
لفظ ور کا بالتشدید استعمال (۲۱) دستوریت (۲۲) بندوق۔ بارود۔ محکمۂ آبکاری (۲۳) بحر مردہ (۲۴) نامہ بر کبوتر (۲۵)
یوروپ کی وسیع ترین زبان (۲۶) سعد بن وقاص کا مزار (۲۷) معاد و خلود طبیعیات کے زاویۂ نگاہ سے (۲۸) اجراء اخبارات
کی تاریخ (۲۹) عالم خیال اور رشک و رقابت (۳۰) خواتین ترکی اور تعلیم (۳۱) نیستی سے ہستی کا امکان، درس نظامی کی
تاریخ (۳۲) طبقۂ نسواں اور غزل گوئی (۳۳) برج بابل (۳۴) طبقۂ فاسسٹ کی وجہ تسمیہ (۳۵) آفتاب کے
داغ (۳۶) سامری کون تھا (۳۷) کیا بدوح خدا کا نام ہے (۳۸) نوٹ کے اجراء کا فائدہ (۳۹) ممی کے پستہ قد محسوس
ہونے کا سبب (۴۰) چند الفاظ کی تحقیق (۴۱) باغ ارم کی حقیقت (۴۲) فلسفۂ مجسطی (۴۳) تمنیؔ کی وجہ تسمیہ (۴۴)
سیم تلغراف (۴۵) میقات حج (۴۶) بندقیہ کی حقیقت (۴۷) طبقۂ متاولہ (۴۸) اصحاب کہف (۴۹) بھوت پریت
(۵۰) فلسفۂ اجتماع (۵۱) جان بل (۵۲) کس کا شعر ہے (۵۳) سال کبیسہ حساب گریگوری میں (۵۴) انڈیا آفس لائبریری
(۵۵) سالویشن آرمی (۵۶) ہار کا سبب (۵۷) عین الزماں طرابلسی (۵۸) تطابق سنہ ہجری و عیسوی (۵۹) کرامات
غوث الاعظم (۶۰) حافظ شیرازی اور تیمور کی ملاقات (۶۱) چند الفاظ کے معنے (۶۲) طاعت و جزا کی تمنا (۶۳) داغ دابیر
(۶۴) الپ ارسلاں (۶۵) معجزہ و کرامات سے انکار (۶۶) صدور محال کا امکان (۶۷) پردہ اور تعلیم نسواں (۶۸) مریخ
کی حقیقت (۶۹) ایران کا صفوی خاندان اور قاچاری حکومت (۷۰) منصور حلاج (۷۱) آنکھ اور چال کی تشبیہ (۷۲)
معجزہ و کرامات (۷۳) آتش منی کا شعر منثور (۷۴) گریۂ معصوم (۷۵) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۷۶) ابو العتاہیہ کے متعلق
چند سوالات (۷۷) فرقۂ معتزلہ کے مختلف فرقے (۷۸) ایک برہم مستفسر کے چند استفسارات (۷۹) کھدر۔ جن۔ تعویذ۔ اردو لغت

(۸۰) بت غالیہ مو (۸۱) اسمائے نجوم (۸۲) بروج اسمار کی حقیقت (۸۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۸۴) ہسپانیہ و اُندلس
(۸۵) حکومت مصر (۸۶) اسماعیلیہ مذہب (۸۷) اعداد متحابہ (۸۸) ادبیات (۸۹) ستاروں کی تعداد (۹۰) بوقلموں (۹۱)
کلام مسیح (۹۲) علی محمد باب (۹۳) مذہب و عقل (۹۴) طوفان نوح (۹۵) دیباچہ کی اصلیت (۹۶) رامائن و مہابھارت
(۹۷) ابدالی اور درانی (۹۸) قلعۂ گوالیار (۹۹) سید جلال (۱۰۰) خلفاء عباسیہ مصر (۱۰۱) نبولا اور اجرام فلکی (۱۰۲)
مرزا عبد القادر بیدل (۱۰۳) یخ فروش نیشاپور (۱۰۴) تشبیہات چشم (۱۰۵) عرب میں گودنے کا رواج (۱۰۶) دیبل کی جائے
وقوع (۱۰۷) طبقۂ نسواں اور تعلیم (۱۰۸) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۱۰۹) شاعری کی بعض اصطلاحیں (۱۱۰) عربی میں تقسیم
علوم (۱۱۱) حقیقت و مجاز (۱۱۲) عالم الیقین و عالم جبروت (۱۱۳) چند اصطلاحات شاعری (۱۱۴) صلوٰۃ الوسطیٰ (۱۱۵)
ظفر کا غیر مطبوعہ کلام (۱۱۶) اوزون فردوسی (۱۱۷) تاناشاہ (۱۱۸) بھتیاسونکل سوسائٹی (۱۱۹) نئی چری (۱۲۰) فیروزہ حصّا
(۱۲۱) برہمو سماج (۱۲۲) ہستناپور (۱۲۳) اڑھائی دن کا جھونپڑا (۱۲۴) مثنوی مولانا روم کا ایک شعر (۱۲۵) پرانا قلعہ
داتا گنج لاہوری (۱۲۶) تغزل اور اصطلاح صوفیہ (۱۲۷) منصور حلاج اور غرقابی فرعون (۱۲۸) بعض الفاظ کے معنے۔
(۱۲۹) کس کا شعر ہے (۱۳۰) کیکاؤس و کیخسرو (۱۳۱) ملا دوپیازہ کی قبر (۱۳۲) میر شیر علی افسوس (۱۳۳) کیا زیب النساء
کے شعر ہیں (۱۳۴) فری میسن کیا ہے (۱۳۵) الف لیلہ (۱۳۶) شیخ بدر عالم۔ شیخ بایزید (۱۳۷) زبان اُردو کی ابتداء سہرا
(۱۳۸) عشق و محبت (۱۳۹) دوسرے کروں میں آثار حیات (۱۴۰) اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال (۱۴۱) انکل سام
(۱۴۲) استعارے کی شاعری (۱۴۳) امیر دوست محمد خاں (۱۴۴) حافظ کے دو شعر (۱۴۵) ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم
(۱۴۶) فرقۂ اسماعیلیہ (۱۴۷) ابن رشد و شیخ الرئیس (۱۴۸) ابو الفضل کی قبر اور غالب کا ایک شعر (۱۴۹) عرفی اور
شاہزادہ سلیم (۱۵۰) زحل۔ ارانوس۔ نبتون (۱۵۱) عمر انسانی (۱۵۲) نسبتی تھانیسری (۱۵۳) عہد اسلام کے سکے
(۱۵۴) سرطان (۱۵۵) ملکۂ چین (۱۵۶) سورۂ فاتحہ (۱۵۷) ہالہ اور مد و جزر (۱۵۸) مونٹ کارلو (۱۵۹) حالی کا
ایک شعر (۱۶۰) نظریۂ تکہرب (۱۶۱) انسولین (۱۶۲) ارتقائے انسانی کی دوسری منزل (۱۶۳) قصر الحمراء (۱۶۴)
بعض اصطلاحات کا ترجمہ (۱۶۵) ارسطو کا مدفن (۱۶۶) یاجوج ماجوج (۱۶۷) مثنوی کا ایک شعر (۱۶۸) ہندی اور
عربی شاعری (۱۶۹) نیوپلوٹنزم (۱۷۰) بیدل کے بعض اشعار (۱۷۱) مثنوی کا ایک شعر (۱۷۲) اپریل فول (۱۷۳)
مشتری (۱۷۴) امریکہ کی دولت

فلسفۂ مذہب مذہب اسلام اور اس کے مراسم و شعائر پر تفصیلی بحث و تنقید اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں قیمت علاوہ محصول عہ منیجر نگار